شتر مرغ ریاست

مستنصر حسین تارڑ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



فہرست مضامین

"غضب خدا کا سسر صاحب ناچ نہیں جانتے"

خواتین و حضرات میں آپ کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مشورہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے اس لیے بات نکلنے نہ پائے۔ میں عزت دار آدمی ہوں اور بے حد شرمندگی بھی محسوس کر رہا ہوں لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ معاشرے کے رواجوں کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ جدید رویوں کے ساتھ مفاہمت کرنی پڑتی ہے ورنہ لوگ دقیانوسی کہتے ہیں۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ کسی کو بتائیں گے نہیں' وعدہ؟

میں دراصل ناچا بننا چاہتا ہوں۔۔۔ میرا مطلب ہے رقص کی ٹریننگ حاصل کرنا چاہتا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فن پر دسترس حاصل کرنے کے لیے کیا اقدام کروں۔ اسی لیے آپ سے رجوع کیا ہے کہ شاید آپ میں سے کوئی "خاندانی" لوگ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں اور میں ٹھمکے لگانے میں ماہر ہو جاؤں۔ ویسے میں نے ذاتی طور پر اس فن پر عبور حاصل کرنے کے لیے خاصی تگ و دو کی ہے لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں رقص کیوں سیکھنا چاہتا ہوں اس کی وجہ میں ابھی ابھی کچھ دیر بعد بیان کروں گا لیکن پہلے میں اپنی ابتدائی کوششوں کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں نے باتھ روم کی عافیت میں "بیلی ڈانس" کرنے کی کوشش کی۔ آپ تو آگاہ ہوں گے کہ یہ رقص عرب دنیا میں بے حد مرغوب ہے اسی لیے میں نے برادرانہ ثقافت کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس میں ایک قباحت سامنے آئی کہ اس ڈانس کے لیے "بیلی" یعنی پیٹ کو لچکانا اور مٹکانا پڑتا ہے۔ اس عمر میں مرغن غذاؤں کے استعمال سے کبھی نوجوانی میں جو "بیلی" تھی وہ اب "بیلے" بن چکا تھا یعنی توند کی صورت اختیار کر چکا تھا

جسے لچکانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ تھوڑا بہت مٹکایا جا سکتا تھا کیونکہ توند کچھ کچھ مٹکے سے مشابہت رکھتی تھی۔ تو مٹکا تو مٹک سکتا ہے ناں۔ لیکن ابھی ایک آدھ مٹکایا ہے تو کمر میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں گنگنانے کی بجائے درد سے کراہنے لگا۔ اسی حالت میں باتھ روم سے باہر آیا تو بیگم نے مجھے کیدو کی طرح لنگڑاتے دیکھ کر غصے سے کہا۔ ہمیشہ منع کرتی ہوں کہ پانی سے بھری ہوئی بالٹی نہ اٹھایا کرو۔ آج پھر ٹچک پڑ گئی ہے ناں؟ میں ابھی رقص والا پرچہ آؤٹ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے فوراً یہ الزام قبول کر لیا کہ مجھے آج پھر دھیان نہیں رہا۔ آئندہ احتیاط کروں گا۔

چند روز کے بعد جب کمر کو قدرے افاقہ ہوا تو میں نے سوچا کہ آج کل کے جو پاپ سنگر ہیں وہ گاتے کم ہیں دھاچوکڑی زیادہ مچاتے ہیں تو ان کے انداز کی کاپی کی جائے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی کیونکہ موسیقی کے لیے اور ردھم کوئی بھی ہو یہ حضرات اپنا اوٹ پٹانگ اچھلنا کودنا الگ سے جاری رکھتے ہیں اس لیے ان کے نقش قدم پر چلنا ممکن نہ تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ جن لڑکیوں کو رقص کا شوق ہوتا ہے وہ فلموں سے سبق حاصل کرتی ہیں اور ہیروئن کی پیروی میں پیر ہلاتی چلی جاتی ہیں تو یہ طریقہ مناسب رہے گا۔ بھلے زمانوں میں جو فلمیں بنتی تھیں ان میں رقص کی آئٹم بالکل الگ ہوتی تھی اور چند ماہر رقاصائیں اس کار خیر کے لیے مخصوص ہوتی تھیں۔ ہیرو اپنے عشق میں ناکام ہو کر کسی نائٹ کلب کا رخ کرتا تھا جہاں ایک ڈانسر اسے دیکھتے ہی محو رقص ہو جاتی تھی اور اس کے گرد گھمن گھیریاں کھاتی لوٹ پوٹ ہوتی اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتی تھی اور ہیرو بوتھی بنائے بیٹھا رہتا تھا بلکہ منہ موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگتا تھا۔ بہت ہوا تو اس قسم کی اداس کیفیت میں ہیرو کو کسی طوائف کے کوٹھے پر لے گئے۔ یعنی اس کے دوست اس کا دل بہلانے کے لیے لے گئے۔ وہاں بھی رقاصہ کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک عدد مجرا پیش کرتی تھی اور فارغ ہو جاتی تھی۔ جب کہ فلم کی ہیروئن کے لیے اس قسم کے رقص شدید معیوب سمجھے جاتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گانے کے دوران کوئی شاخ تھام لیتی تھی اور پورا گانا اس ایک سپاٹ پر اختتام پذیر ہو جاتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار ذرا لبرل ہو کر وہ نزدیکی ستون کے گرد ایک پھیرا لگا کر واپس اپنی شاخ کے پاس آ جاتی تھی۔ لیکن ان دنوں صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ ہیروئن بے شک ایک سکول ٹیچر ہو۔ نہایت شرمیلی اور باپردہ ہو اور بات بات پر اخلاقیات کا درس دے لیکن پندرہ بیس گانوں سے کم میں اس کی تسلی نہیں ہوتی اور جو رقص فرماتی ہے تو بدن کے ہر حصے سے فرماتی چلی جاتی ہے۔ کسی ایک مقام پر نہ وہ ٹھہرتی ہے اور نہ

آپ کی نظر ٹھہرتی ہے۔ بہر حال میری مجبوری تھی اس لیے وی سی آر پر گانوں کی ایک کیسٹ لگا کر میں ڈرائنگ روم کے درمیان میں کھڑا ہو گیا اور جونہی موسیقی کی دھمادھم پر ہیروئن کودنے لگی میں نے اس کی پیروی کرنے کی کوشش کی اور پہلے دس سیکنڈ میں ہی سانس پھول گیا۔ اب یہ تھا کہ میں کمر پر ہاتھ رکھے منتظر رہتا کہ کب ہیروئن تھرکنا بند کرے اور فضا میں بازو لہرا کر کوئی ایکشن دے تو میں اس کی پیروی کروں۔ تھوڑا سا فائدہ یہ ہوا کہ ٹھمکا لگانے کے ابتدائی اصولوں سے واقفیت ہو گئی۔ ابھی وی سی آر پر پہلا گانا ہی چل رہا تھا اور میں ٹھمکا لگانے کی کوشش میں گرتے گرتے بچتا تھا کہ بیگم جو صبح سویرے سارے دن کے لیے میکے سدھار چکی تھیں۔ یکدم منظر پر نمودار ہو گئیں۔ اس نے ایک نظر وی سی آر پر تھرکتی باحیا خاتون کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھا اور غش کھاتے کھاتے بچی۔ "خدایا یہ آپ اس عمر میں کیا کر رہے ہیں؟ میرے گھر والے تو پہلے ہی نہیں مانتے تھے کہ لڑکا ٹیلی ویژن پر آتا ہے۔ اب خیر سے ناچے بھی ہو گئے ہیں۔"

میں ابھی اپنے رقص کے منصوبے کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا "نہیں نہیں بیگم تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل آج صبح سیر کے لیے نہیں جا سکا تو بدن میں تھوڑی سی کسل مندی تھی اسے دور کرنے کے لیے ورزش کر رہا ہوں۔ جین فونڈا کی ورزشوں والی کیسٹ نہیں ملی تو یہ ریما اور صائمہ وغیرہ سے ہی کام چلا رہا ہوں۔"

بیگم کو یقین تو نہیں آیا لیکن ذرا مسکرا کر کہنے لگیں۔۔ "سکرین پر تو ایک ہی خاتون اپنے کمالات دکھار ہی ہے بلکہ جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے وہ بھی دکھار ہی ہے اور تم کہتے ہو کہ ریما اور صائمہ دونوں ہیں۔"

"دراصل ہے تو ایک لیکن ابھی پہچانی نہیں جا رہی۔ تھرکنا اور اچھلنا بند کرے تو پتہ چلے کہ ان میں سے کون ہے۔ یوں بھی تمہیں پتہ ہے ان دنوں ہیروئن کا سب کچھ دکھا دیتے ہیں لیکن چہرہ کم ہی دکھاتے ہیں۔"

رقص پر عبور حاصل کرنے کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ تب مجھے مہاراج کتھک بہت یاد آئے کہ دلّی مسلم ہوٹل انار کلی میں فروکش تھے اور ہر خواہشمند کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ دیتے تھے۔ نہایت نفیس طبیعت کے اعلیٰ انسان تھے اور واحد مرد رقاص تھے جنہیں دیکھ کر ان کی جنس پر شبہ نہیں ہوتا تھا۔ مرد ہی لگتے تھے اور اچھے لگتے تھے۔ ہم بھی انہی دنوں ڈاکٹر انور سجاد کی طرح ان سے کتھک سیکھ لیتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ڈاکٹر ساگا کے پاس جانے سے بھی جھجھکتا ہوں کیونکہ حیوانات کے ڈاکٹر ہیں خواہ مخواہ مجھ میں بھی کوئی

بیماری دریافت کرلیں۔ ویسے بھی وہ پچھلے پچاس برس سے مورڈانس کررہے ہیں اور مور کے پروں کا جو رنگین پنکھا کمر میں باندھ کر رقص کرتے ہیں اس کے پر بھی جھڑ چکے ہیں اور صرف تنکے باقی رہ گئے ہیں۔ موروں نے اس دوران شاید ساگا صاحب کو دیکھ لیا تو انہوں نے اپنے رقص کا انداز ہی بدل لیا۔

ویسے پاکستان کے مختلف حصوں میں رقص کے بارے میں رویّے سراسر مختلف ہیں۔ سندھی اور بلوچی رقص کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ نہایت باریش اور متشرع بزرگ بھی اس میں شامل ہوتے ہیں اور بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ ہمارے پٹھان بھائیوں کو تو خدا ایسا موقع دے کہ وہ "یا قربان" کا نعرہ لگا کر اپنے بال جھٹکتے پاؤں سے دھول اڑاتے بے خود ہو جائیں۔ شمالی علاقہ جات میں تو رقص کے بغیر کوئی محفل مکمل نہیں ہوتی۔ بلتی لوگ لوک گیت الاپنے اور پھر الاؤ کے گرد رقص کرنے میں ماہر ہیں۔ سارا دن بوجھ اٹھائیں گے لیکن شام کو تھکاوٹ بھول کر کسی برتن کو اوندھا کر کے تال دینے لگیں گے اور ناچنے لگیں گے۔ اہل ہنزہ بھی کسی سے کم نہیں۔ کہیں سے موسیقی کی کوئی دھن تیرتی ہوئی آئی تو ان کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور پھر خود کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک بار گلگت کے نواح میں ایک کوہستانی مگر پُر آسائش گھر کے باہر خوبانیوں کے باغ میں ایک دعوت تھی۔ طعام سے پیشتر میرے میزبان نے تقریباً اپنے ہم عمر قبلہ ماموں جان سے تعارف کروایا اور کہا کہ جناب آپ کیا سمجھتے ہیں یہ ماموں جان ہنزہ کے نمبرون ڈانسر ہیں۔ ماموں ذرا ہو جائے اور ماموں جان نے فوراً موسیقی آن کر کے اپنے کمالات دکھانے شروع کر دیئے اور واقعی وہ بہت عمدہ رقص کرتے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد ان کے بیٹے بھی تالیاں بجاتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بعد میں ایک بیٹے نے نہایت فخر سے بتایا کہ ابا جی اتنا اچھا ناچتے ہیں کہ رشک آتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر ہم اپنے قبلہ ماموں جان کو کہتے کہ ذرا ناچو۔ تو ماموں نہ صرف متعدد جھانپڑ رسید کرتے بلکہ قطع تعلق بھی کر لیتے اور نہ ہی ہم اپنے والد صاحب کے بارے میں اس قسم کا بیان دے سکتے تھے۔ صرف اس لیے کہ پاکستان کے تمام خطوں سے الگ پنجابی بھائی اس فعل کو نہایت معیوب گردانتے ہیں اور اگر کسی کے بارے میں بھنک بھی پڑ جائے کہ موصوف کو ناچنے میں دلچسپی ہے تو اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں شدید شبہات جنم لینے لگتے ہیں۔ پیارے خواتین و حضرات اب اس پس منظر میں آپ اگر یہ پوچھیں کہ تمہیں اب کیا تکلیف ہے کہ ناچے ہو جانا چاہتے ہو تو میں عرض کرتا ہوں کہ رقص سیکھنا یکدم میرے لیے کیوں ضروری ہو گیا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں اپنی الگ محفل سجا کر خفیہ طور پر ڈھولکی کی تھاپ پر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھیں۔ اجتماعی اور مخلوط رقص کا تصور بھی محال تھا لیکن اب پتہ نہیں یہ کیسی تبدیلی آئی ہے کہ پہلے سے زیادہ مذہب میں دلچسپی ہے لیکن اس کے باوجود جس شادی میں جائیں، جس مہندی میں شریک ہوں وہاں بھنگڑا موسیقی پر ہر خاص و عام بے دریغ رقص میں مشغول ہیں اور کوئی عار نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ لڑکی والے بھی باہیں اٹھا کر گلے میں دوپٹے ڈال کر مقابلے میں اتر آتے ہیں۔ ایک ایسی ہی محفل میں بہت ہی لاچار خواتین و حضرات کے علاوہ شاید صرف یہ حقیر بندۂ پُرتقصیر تھا جو کان لپٹے بیٹھا رہا اور خلق خدا دھمال ڈالتی رہی تو ایک عزیز دوست نے نہایت دردمندی سے بے حد خلوص سے کہا "یار تم ساری عمر گھامڑ ہی رہو گے۔ آخر تم نے بھی بچوں کی شادیاں کرنی ہیں تو کیا وہاں بھی بدھو بن کے بیٹھے رہو گے۔ ان کی خوشی میں شریک نہیں ہو گے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ والد صاحب کو ناچنا بھی نہیں آتا۔ اب بھی وقت ہے کچھ سیکھ لو ورنہ بڑی بے عزتی ہو گی۔"

خواتین و حضرات میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پسینے چھوٹ گئے کہ میں نے انشاء اللہ بچوں کی شادیاں تو کرنی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسری طرف سے اعتراض ہو جائے کہ سسر صاحب کو تو ناچنا بھی نہیں آتا۔ بچوں کا مستقبل خدانخواستہ صرف اتنی سی کوتاہی سے تاریک ہو جائے۔ بس اسی لیے میں فوری طور پر رقص سیکھنا چاہتا ہوں۔ ناچ گانے کی ٹریننگ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ فرمائیں کہ اس سلسلے میں آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟

☆☆..........☆☆

"گداگری ایک معزّز پیشہ ہے......"

کہتے ہیں دو حضرات آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کس کا خاندان زیادہ پُروقار اور اعلیٰ ہے' کس کے خاندان کی عزت معاشرے میں زیادہ ہے...... اور بالآخر جب ایک صاحب قدرے حاوی نظر آنے لگے تو دوسرے نے کہا "لیکن تمہارے والد صاحب تو بھیک مانگتے ہیں۔"

پہلے صاحب نے سر ہلا کر کہا "بھیک مانگنے کا شوق تو تمہارے والد صاحب کو بھی ہے لیکن وہ کتوں سے ڈرتے ہیں۔"

پتا نہیں بھیک مانگنا انسانی جبلت میں شامل ہے یا کیا ہے اور اس کا جواب تو کوئی ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے لیکن نہایت متمول معاشروں میں بھی لوگ بھیک مانگنے سے باز نہیں آتے۔ شنید ہے کہ امریکہ میں تو زبردستی بھیک لے لیتے ہیں۔ یورپ میں کئی بار تجربہ ہوا کہ آپ رات کو گھر لوٹ رہے ہیں تو سامنے سے ایک تھری پیس سوٹ میں ملبوس صاحب چلے آ رہے ہیں' قریب آ کر انہوں نے نہایت تہذیب یافتہ انداز میں "گڈ ایوننگ" وغیرہ کہا اور پھر سرگوشی کی "جناب دو چار پاؤنڈ عنایت کر دیجئے...... بیئر پینے کو جی چاہ رہا ہے۔" اکثر ایشیائی تو اس شوق میں پاؤنڈ عطا کر دیتے ہیں کہ گورے کو بھیک دے رہے ہیں...... چین میں بھی دیکھا کہ پولیس کی نظروں سے بچ کر کوئی باباجی آتے ہیں اور چینی زبان میں دعائیں دینے لگتے ہیں۔

ایک مرتبہ جرمنی میں ایک سفید فام سیاح سے ملاقات ہوئی...... موصوف پیشے کے لحاظ سے سکول ٹیچر تھے اور نہایت ادبی قسم کی گفتگو کرتے تھے' شام ہوئی تو میں نے پوچھا کہ "کھانے کا کیا پروگرام ہے؟"

کہنے لگے "ابھی تو کچھ پتا نہیں کہ کہاں کھاؤں...... شاید کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں یا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر...... ہو سکتا ہے کسی گھر میں کھاؤں۔"

میں نے کہا "لیکن تمہارا ارادہ کیا ہے کہ کھانا کہاں کھانا ہے؟"

داڑھی میں انگلیاں چلا کر بولے "یہ تو جنہوں نے کھانا کھلانا ہے' ان کو پتا ہو گا کہ کہاں کھلانا ہے۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"میں مانگ کر کھاتا ہوں۔" وہ نہایت اطمینان سے کہنے لگے۔

میں نے مزید حیرت زدہ ہو کر ایک اور "کیا مطلب؟" کہا۔

"بھئی حرام ہو جو میں نے زندگی بھر اپنے پلّے سے کھانا کھایا ہو۔" انہوں نے قطعی طور پر شرمندہ ہوئے بغیر بیان دیا۔

"یعنی آپ سکول میں پڑھاتے ہوئے لنچ کے دوران کلاس سے باہر نکلتے ہیں اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنے لگتے ہیں کہ ہے کوئی سخی بابا وغیرہ......"

"نہیں' نہیں......" وہ میری حماقت پر ہنسنے لگے۔ "میں وہاں تو اپنے فلیٹ میں خود پکاتا ہوں' صرف جب سفر پر نکلتا ہوں تو مانگ کر کھاتا ہوں' کسی بھی فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر پانچ سات لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ بھئی غریب ٹورسٹ ہوں' کھانا کھانا چاہتا ہوں تو کوئی نہ کوئی کھلا دیتا ہے۔ آج تک ناکام نہیں ہوا اور کھانے میں بھی ورائٹی ہو جاتی ہے اور کئی بار تو ضرورت مند خواتین گھر بھی لے جاتی ہیں اور رہائش کا انتظام بھی اسی طرح ہو جاتا ہے مانگ مانگ کر...... تم بھی آ جاؤ بہت لطف اندوز ہو گے اس تجربے سے......"

اندر سے تو میرا جی چاہا کہ ذرا لطف اندوز ہوا جائے لیکن پھر سوچا کہ کسی نے دیکھ لیا اور پاکستان میں خبر کر دی تو گھر والوں کا کیا حال ہو گا کہ بچہ جرمنی میں بھیک مانگ رہا ہے۔

ویسے اللہ میاں کو جان دینی ہے' دو مرتبہ تو مجھے بھی اتفاق ہوا ہے مانگ کر کھانے کا...... ایک بار جرمنی میں ہی ایک گٹار بجانے والے صاحب نے مجھے اپنا ساتھی بنایا تھا اور اس پر فارمنس سے جتنے پیسے اکٹھے ہوئے تھے' ان سے کھانا کھایا تھا...... دوسری بار میں نے ایک ڈرامے میں فقیر کا کردار ادا کیا تھا اور گلے میں مالائیں ڈالے' داڑھی لگائے' ہاتھ میں کشکول پکڑے مال روڈ پر "دے جا سخی بابا اللہ کے نام پر" کی صدائیں لگاتا تھا...... چونکہ گیٹ اپ بہت عمدہ تھا' اس لیے خاصی "آمدنی" ہو گئی اور خیرات کی اس رقم سے ٹیلیویژن کے پورے عملے

نے بوتلیں وغیرہ پی تھیں...... میں نے برگر کھایا تھا...... شاعر اور ادیب برادری میں بھی ایسے ایسے باکمال لوگ ہو گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں جو زندگی اسی طور بسر کر گئے یا کرتے ہیں۔

پاک ٹی ہاؤس میں جانے والے لوگ ایک نہایت نفیس صاحب "ڈاکٹر موت" کو جانتے ہوں گے...... ڈاکٹر صاحب اللہ جانے پندرہ یا بیس برسوں سے کسی میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے...... ان دنوں میڈیکل کالجوں کی پالیسی تھی کہ طالبعلم بے شک ساری عمر فیل ہوتا رہے' اسے کالج سے نکالا نہیں جاتا تھا چنانچہ یہ ڈاکٹر صاحب بھی اسی اصول کے تحت ایک عرصے سے میڈیکل سٹوڈنٹ تھے' ہمیشہ ڈاکٹروں والے سفید اوور آل میں ملبوس ہوتے اور ہمیشہ کچھ غتر بود سے رہتے اور ہمیشہ ہی "راکٹ" پر سوار کسی اور جہان میں ہوتے...... انہیں پیار سے ڈاکٹر موت کے نام سے پکارا جاتا تھا...... یہ ڈاکٹر صاحب بھی اکثر ٹی ہاؤس میں چندہ جمع کرتے نظر آئے...... ٹولنٹن مارکیٹ کا کونہ ان کا مرغوب مقام تھا جہاں وہ خلق خدا سے اپنے حصے کی دولت حاصل کرتے رہتے۔

کچھ اسی نوعیت کے ایک اور شاعر تھے اور بہت عمدہ شاعر تھے...... وہ مہینے کی پہلی تاریخوں میں متمول ادیبوں کے ہاں پہنچتے اور اپنی "تنخواہ" وصول کرتے...... ٹی ہاؤس میں بھی وہ صرف ایک دس روپے کے نوٹ کے طالب ہوتے لیکن ڈاکٹر موت اور ان شاعر کی اپنی مجبوریاں تھیں' نشے کی طلب میں ٹوٹتا شخص لاچار ہوتا ہے...... ایک ایسے صاحب بھی ہیں جو ہر کسی سے قرض مانگتے ہیں اور اتنے پیار سے مانگتے ہیں کہ انسان بے اختیار ہو کر بٹوہ خالی کر دیتا ہے اور یہ ریکارڈ ہے کہ آج تک انہوں نے قرض واپس نہیں کیا...... جب دوست ختم ہو گئے تو دوستوں کے دوستوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا...... شاید وہ بھی اس معاملے میں مجبور ہیں جیسے کچھ لوگوں کو اور متمول لوگوں کو بڑے سٹورز میں سے چیزیں اٹھالانے کی لت ہوتی ہے اسی طرح کچھ لوگ قرض لینے پر بھی مجبور ہوتے ہیں...... یہ بھی ایک قسم کی بھیک ہوتی ہے...... ہمارے ایک دوست کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی دکان سے کتابیں چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے حضرات اور خواتین کی فہرست شائع کی جائے تو پاکستان میں زلزلہ آجائے کہ ہیں معاشرے کے اتنے بڑے بڑے ستون اور نامور لوگ بھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ ہمارے ایک خاندانی ملازم تھے بابا جی...... بلکہ یوں سمجھئے کہ خاندان کے ایک فرد تھے...... تنخواہ کا کوئی حساب نہ تھا' جب جی چاہتا کچھ رقم مانگ لیتے' ہمارے بچے جب بڑے ہوئے تب ان کو معلوم ہوا کہ بابا جی ہمارے خاندان کے فرد نہیں ہیں تو ان بابا جی نے اپنے ایک بیٹے کی شادی لاہور کے قریب ایک گاؤں میں کی'

گاؤں کے مطابق وہ متمول لوگ تھے لیکن شادی کے بعد ایک روز بابا جی کو انتہائی پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ "بابا خیریت تو ہے ناں؟" کہنے لگے "چودھری صاحب! بات کچھ ایسی ہے کہ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا' سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں......" میں نے زور دے کر پوچھا کہ "آپ بتائیں تو سہی کہ کیا پریشانی ہے۔"

کہنے لگے "پچھلے دنوں میری بہو کا باپ اسے ملنے آیا' ہم نے خوب خاطر وغیرہ کی پھر وہ چلا گیا' میں اسی وقت کسی کام سے باہر نکلا تو وہ کمبخت گلی کی نکڑ پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے بھکاریوں کے خاندان میں بیٹے کو بیاہ دیا؟"

"نہیں جی گاؤں میں اچھے بھلے لوگ ہیں...... لیکن اس بدبخت کو جانے کیا بیماری ہے' ہمارے گھر آتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو ہمارے ہی محلے میں بھیک مانگنے لگتا ہے...... اب بتائیں میری کیا عزت رہ گئی...... ایک روز آیا تو واپسی پر میں ساتھ ہو لیا' اڈے پر جا کر اس کے لیے ٹکٹ خریدا اور بس میں بٹھایا' بعد میں معلوم ہوا کہ بس چلتے ہی اپنی نشست سے کھڑا ہو کر بھیک مانگنے لگا...... بہو سے پوچھا ہے تو وہ کہتی ہے کہ بس ابا جی پریشان ہوتے ہیں تو بھیک مانگنے لگتے ہیں ورنہ عادی ہرگز نہیں ہیں۔ آپ ہی بتائیں اب کیا کروں...... بہو اچھی ہے' اسے کیسے گھر سے نکال دوں...... ادھر محلے میں لوگ میری عزت بھی بہت کرتے ہیں چنانچہ اس بدبخت کو بھیک بھی بہت دیتے ہیں کہ اپنے بابا جی کا قریبی عزیز ہے۔"

بابا جی پر اللہ کا کرم یوں ہوا کہ بیٹے کے سسر صاحب کسی بس پر بیٹھے اور پتا نہیں کہاں چلے گئے...... آج تک واپس نہیں آئے۔

لاہور کے پرانے شہر میں ایک فقیر ہوا کرتے تھے' خاندانی قسم کے گداگر تھے...... لوہاری دروازے کے باہر ایک پھٹی ہوئی دری پر بیٹھتے تھے' لگے بندھے "گاہک" تھے جو انہیں اتنی رقم بخش دیتے جس سے گزارہ آسانی سے ہو جاتا تھا' ان کا ایک بیٹا تھا جو پہلے تو انہیں اسسٹ کرتا تھا پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ ایک خوانچہ لگا کر بیٹھ گیا پھر آہستہ آہستہ اپنی محنت سے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لیا یہاں تک کہ دو تین ملازم بھی رکھ لیے' شادی بھی کسی غیر گداگر گھرانے میں ہو گئی تب اس نے والد صاحب کو ان کے فقیرانہ اڈے سے اٹھایا اور گھر میں لا بٹھایا کہ ابا جی میری بے عزتی ہوتی ہے' بھیک نہ مانگا کریں...... چنانچہ بہو انہیں چارپائی پر بٹھا کر خدمت خاطر کرنے لگی' کھانا وہ اب بھی برتنوں میں نہیں کھا سکتے تھے' سالن کو روٹی پر انڈیل کر کھاتے...... پھر ایک روز ایسی بے مقصد زندگی سے بیزار ہوئے اور گھر سے باہر نکل کر مانگنے لگے...... بیٹا ڈانٹ ڈپٹ کر واپس لایا اور حفظ ماتقدم کے طور پر

انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا تاکہ موصوف پھر نہ فرار ہو جائیں اور موصوف کیا کرتے؟ گلی میں کھلتی کھڑکی کے پٹ چپکے سے کھولتے' اپنا ہاتھ باہر نکالتے اور "دے جا سخی بابا...... کر بھلا سو ہو بھلا......" لیکن سرگوشی کے انداز میں تاکہ صحن میں بیٹھی بہو نہ سن لے...... یہ طریقہ' واردات کئی ہفتے تک کامیابی سے چلا پھر ایک روز گلی میں سے گزرتے اپنے ہی بیٹے سے سوال کر بیٹھے...... بیٹے نے کھڑکی میں تختے ٹھکوا دیئے اور یوں والد صاحب اس تفریح سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے......

گداگری اگر انفرادی سطح تک رہے تو اس میں قباحت تو ہوتی ہے لیکن بات پھیلتی نہیں البتہ ایک قوم اجتماعی طور پر بھیک مانگ کر گزارہ کرنے لگے تو عزت نفس ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے...... ہم جذباتی ہو کر کشکول بھی توڑ دیتے ہیں لیکن اگلے ہی لمحے اسے پھر سے جوڑ کر برادر ملکوں کے دورے پر نکل جاتے ہیں...... آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں اور دے جا سخی بابا...... کر بھلا سو ہو بھلا...... شاہ حسین نے کہا تھا۔

اساں ٹکر منگ منگ کھاؤنا
اساں ایہو کم کماؤنا

یعنی ہم نے ہمیشہ روٹی مانگ مانگ کر کھانی ہے اور اسی طور زندگی بسر کرنی ہے۔

☆☆......☆☆

"ہمارا رشتہ کیسے ہوا"

کل ایک نوجوان میرے پاس آیا' نہایت ملول' رنجیدہ اور دل گرفتہ' داڑھی بڑھی ہوئی پریشان حال پریشان بال' میں نے سمجھا شاید کسی عزیز کا انتقال پُر ملال ہو ہی گیا ہے تو یہ حالت بنا رکھی ہے۔ پہلی بات جو اس نے بنا اپنا تعارف کروائے کہی یہ تھی کہ تارڑ صاحب آپ کی شادی کیسے ہو گئی؟

مجھے بہت ناگوار گزرا کہ نہ سلام نہ دعا اور یہ ناہنجار نوجوان ذاتیات پر اتر آیا ہے۔

"تم کون ہو پوچھنے والے؟"

کہنے لگا "میں آپ کی تحریریں پڑھنے والا ہوں۔ ہم جیسے بے وقوف لوگ نہ ہوں تو آپ بھوکے مر جائیں۔ اس لیے ہمارا حق بنتا ہے کہ ہمیں کوئی پرابلم ہو تو آپ سے بیان کریں اور رہنمائی حاصل کریں۔ پلیز آپ بتائیں کہ آپ کی شادی کیسے ہو گئی تھی؟"

"کیسے' کا کیا مطلب۔ ہم جوانِ رعنا ہوا کرتے تھے۔ ہمیں کسی نے بتایا تو نہیں کہ ہم جوانِ رعنا ہوا کرتے تھے یہ ہمارا خیال ہے کہ ہم ہوا کرتے تھے۔ برسرِ روزگار تھے۔ کم از کم ہمارے والد صاحب برسرِ روزگار تھے۔ ہم اگرچہ آوارہ گردی کے شوقین تھے اور کام کاج کرنے سے ہماری جان جاتی تھی اور پڑھنے لکھنے کے علاوہ اور کام آتا بھی نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قبلہ والد صاحب ایک عرصے سے برسرِ روزگار تھے۔ چنانچہ ہماری شادی ہو گئی اور ہم نے آنکھیں بند کر کے شادی کر لی۔ آج تک نہیں کھولیں۔"

"نہیں جناب۔" نوجوان کی اس جواب سے خاطر خواہ تسلی نہ ہوئی۔ "یعنی یہ رشتہ وغیرہ کیسے طے ہوا؟"

"بھئی وہ ہماری ہمشیرہ کی ایک سہیلی ہوا کرتی تھیں۔ ان سہیلی کے عزیزوں میں ایک خاتون تھیں جو ہمشیرہ صاحبہ کو بے حد پسند آ گئیں۔ یہ الگ بات کہ بعد میں اس پسند میں کمی واقع ہو گئی۔"

"لڑکی والوں نے کوئی اعتراض وغیرہ تو نہیں کیا تھا؟"

"نہیں بھئی۔ انہیں مکمل کوائف کے بارے میں لاعلم رکھا گیا۔ لیکن جن دنوں بات چل رہی تھی ان دنوں ایک چھوٹی سی پرابلم ہو گئی۔"

"اور وہ پرابلم کیا تھی؟"

"لڑکی والے جو پہلے نہایت سرگرم تھے یکدم سَرد سرد ہو گئے۔ والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ جناب کوئی مسئلہ ہے وہ کہنے لگے کہ ہمیں مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ لڑکا ریس کھیلتا ہے۔ متعدد معاشقے کر چکا ہے اور کر رہا ہے۔ چلئے یہاں تک تو ہم درگزر کر سکتے تھے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مے خوری کا بھی شوقین ہے اور ہر رات گھر واپس آتا ہے تو' یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے یہ تیری نظر کا قصور ہے۔ گا رہا ہوتا ہے۔ اس پر والد صاحب طیش میں آ گئے اور پوچھا کہ یہ سب آپ کو کس نے بتایا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جی لڑکے کے بہترین دوست نواز بیٹریوں والے نے بتایا ہے۔"

"آپ کا کوئی اس نام کا بہترین دوست تھا؟"

"بالکل تھا۔ میری تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔ بڑی مشکل سے ایک رشتہ ملا تھا اور وہ بھی ہاتھ سے جا رہا تھا اور یہ جنازہ جائز کروانے کا آخری چانس تھا۔ چنانچہ میں نے اس بہترین دوست نواز کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تم نے میرے بارے میں یہ بیہودہ بکواس کی ہے۔ وہ ہنس کر کہنے لگا آہو کی ہے۔ میں نے کہا کیا میں ریس کھیلتا ہوں' مجھے تو آج تک گھوڑے اور گھوڑی میں فرق نہیں معلوم ہو سکا۔ اور نہ میں کبھی ریس کورس کے اندر گیا ہوں۔ بہترین دوست پھر ہنسا اور کہنے لگا' تم ہمارے ساتھ دو آنے چال کے حساب سے تاش نہیں کھیلتے اور پھر بعد میں جو جیتے وہ تکے کباب کھلاتا ہے۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ تم ریس کھیلتے ہو' میں نے کہا تھا تم جوا کھیلتے ہو اور وہ تم کھیلتے ہو۔"

"اور یہ معاشقوں والی بات؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو تمہارے سفرنامے گواہ ہیں اور مے خوری کا تذکرہ میں نے محض مذاق میں کیا تھا۔"

"تارڑ صاحب۔ نوجوان ذرا بیزار ہو گیا۔ اتنی تفصیل نہیں چاہیے' ابھی میں نے

اپنی پرابلم بھی بیان کرنی ہے۔ ذرا مختصر بات کیجئے۔"

"مختصر یہ کہ بہترین دوست کے مطابق وہ تو یونہی مذاق کر رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت ہے اور وہ ذاتی طور پر لڑکی والوں کے ہاں جا کر حلفیہ بیان دے سکتا ہے کہ میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن یہ منصوبہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ بہرحال والد صاحب نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ برخوردار نہایت نیک اطوار اور نفیس چال چلن کا مالک ہے اور یہ جو سفرناموں میں خواتین کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ سب جھوٹ ہے۔ البتہ والد صاحب نے انہیں میرے ٹیلیویژن پر کام کرنے کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور رشتہ ہو گیا۔"

"ان کے پاس ٹیلیویژن نہیں تھا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"نہیں۔ نہایت مذہبی خاندان تھا۔ بہرحال تم بتاؤ کہ تمہاری کیا پرابلم ہے؟"

نوجوان جو پہلے ہی نہایت ملول' رنجیدہ اور دل گرفتہ تھا اب مزید ملول وغیرہ ہو گیا۔ "میرا رشتہ نہیں ہو رہا' جناب عالی' میری ہمشیرہ کی کوئی ایسی سہیلی بھی نہیں جس کے ساتھ میرا رشتہ ہو سکے۔ آپ بتائیے میں کیا کروں؟"

"بھئی تم کوئی لڑکی پسند کرو اور گھر والوں کو اس کے گھر بھیج دو۔"

"جس بھی لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں وہ مجھے پسند نہیں کرتی تو کیا کروں؟"

تو پھر اپنے آپ کو پوشیدہ رکھو اور گھر والوں کو اس کے گھر بھیج دو۔

"یہ بھی کر دیکھا لیکن ماسی کرم بی بی نے کام خراب کر دیا۔"

"وہ کون ہے؟"

"ماسی کرم بی بی بس ماسی کرم بی بی ہے اور ہمارے خاندان میں رشتے کروانے کی ایکسپرٹ سمجھی جاتی ہے وہ جانتی ہے کہ لڑکی کے گھر والوں کے ساتھ کیا گفتگو کرنی چاہیے کہ وہ متاثر ہو جائیں۔ لڑکی کو کیسے پرکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔"

"تو ماسی کرم بی بی ایکسپرٹ ثابت نہیں ہوئی؟"

"ہوئی جناب عالی۔ لیکن اس کے ہرے سوٹ اور سرخ گرگابی نے کام خراب کر دیا۔ ماسی کو اس قسم کے کپڑے پہننے کا بڑا شوق ہے۔"

"ماسی کے ہرے سوٹ اور سرخ گرگابی کے رشتے سے کیا تعلق۔"

"میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ میرے والدین اور ماسی صاحبہ لڑکی والوں کے گھر گئے۔ جب لڑکی کمرے میں آئی تو ماسی نے اس کا جائزہ لیا اور کہنے لگی۔ کڑیئے ذرا کمرے

میں چل پھر کے دکھاؤ میں نے تمہاری چال دیکھنی ہے۔ لڑکی ذرا غصیلی اور ماڈرن تھی چمک کر کہنے لگی۔ آپ ذرا کمرے سے باہر آئیں میں آپ کو چل پھر کر دکھاتی ہوں۔ اس کے والدین نے اسے ڈانٹا کہ بزرگوں کو جواب نہیں دیتے۔ اس کے بعد ماسی نے چائے پی اور ڈائننگ ٹیبل پر سجی ہوئی ہر شے چٹ کر گئی۔ آخر میں پھر لڑکی سے کہنے لگی 'بیٹی تم نے ابھی تک ہنس کر نہیں دکھایا۔ میں نے تمہارے دانت دیکھنے ہیں۔ اس پر لڑکی نے بہت بد تمیزی کی اور کہنے لگی پہلے آپ اپنے دانت دکھائیں پھر میں دکھاؤں گی۔ قصہ مختصر انکار ہو گیا۔"

"بھئی آپ کے والدین کو چاہیے تھا کہ لڑکی والوں کو سمجھاتے کہ یہ ماسی کرم بی بی سگی ماسی نہیں ہے اور یونہی ساتھ میں چلی آئی ہے۔"

"انہوں نے بہت کوشش کی بلکہ لڑکی والوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ ہم نے ماسی کی باتوں کا برا نہیں مانا لیکن لڑکی کا کہنا تھا کہ بے شک یہ لڑکے کی سگی ماسی نہیں تھی لیکن اس نے ہرا سوٹ اور سرخ گرگابی پہن رکھی تھی اور میں ایسے خاندان میں نہیں جاؤں گی جہاں لوگ اس قسم کے کپڑے پہنتے ہوں۔"

"برخوردار" میں نے نوجوان کی ڈھارس بندھائی، "زمانہ بدل چکا ہے لوگ ماڈرن ہو چکے ہیں اور اس زمانے میں اگر رشتے کے لیے جانے والے ہرا سوٹ اور گرگابی پہنیں گے تو کام چوپٹ ہو جائے گا۔ آپ کا انداز ماڈرن ہونا چاہیے۔ مناسب لباس ہو اور دوسروں کے گھر جا کر کھانے پر ٹوٹ نہیں پڑنا۔ اور لڑکی کو دانت دکھانے کے لیے تو ہرگز نہیں کہنا۔"

"یہ بھی کر دیکھا جناب عالی۔ کام پھر خراب ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک اور رشتہ تھا۔ میرے والدین اور دو پھپھیاں جو نہایت ماڈرن ہیں ہمراہ گئیں۔ انہوں نے لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لڑکی نے چائے کے بعد چینی دان پیش کیا کہ کتنے چمچے چینی پسند کریں گے۔ چاروں نے ماڈرن ہونے کے چاؤ میں انکار کر دیا کہ ہم تو چینی کے بغیر چائے پیتے ہیں۔ صرف ایک ایک سموسہ کھایا اور کیک کھانے سے بھی انکار کر دیا کہ ہم میٹھا نہیں کھاتے اور جناب پھر بھی رشتے سے انکار ہو گیا۔"

"آخر کیوں؟"

"لڑکی کے گھر والوں نے کہا کہ یہ تو پورا خاندان چینی استعمال نہیں کرتا۔ اس کا مطلب ہے انہیں شوگر کی بیماری ہے۔ لڑکے کو بھی ہو گی۔ اور اگر شادی کر دی تو ظاہر ہے بعد میں اولاد کو بھی ہو گی اس لیے وہاں سے بھی انکار ہو گیا۔ اب آپ بتائیں کیا کروں؟"

"اب تم شادی کا خیال چھوڑو اور اللہ اللہ کرو۔"

چنانچہ وہ اللہ اللہ کرتا چلا گیا۔

نوجوانوں سے میری التماس ہے کہ اگر وہ شادی کروانے کے بارے میں سنجیدہ ہیں تو لڑکی کے گھر اپنی ماسی کرم بی بی کو ہرے سوٹ اور سرخ گرگابی میں نہ بھیجیں اور چائے کے ساتھ چینی ضرور استعمال کریں۔ اگوں تیرے بھاگ لچھیے؟

☆☆......☆☆

”موسم بدل رہا ہے“

موسم بدل رہا ہے۔

اس لیے نہیں کہ ایٹمی دھماکے ہوئے ہیں۔اس لیے بھی نہیں کہ ہر طرف سی ٹی بی ٹی کی سیٹیاں بج رہی ہیں کالاباغ ڈیم آکر جاچکا ہے اور پندرہویں ترمیم ہواؤں میں ہے۔بلکہ یہ ان کے باوجود بدل رہے ہیں کیونکہ ستمبر آگیا ہے۔ ہمیں ان چاروں واقعات میں سے صرف سی ٹی بی ٹی پر اعتراض ہے کیونکہ یہ ہمارا گھریلو معاملہ تھا۔ میرا اور میری بیگم کا اور اب پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہو رہی ہے۔سیاسی بیان بازی ہو رہی ہے اور جو سی ٹی بی ٹی کے 'موجد' ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ میرے دونوں بیٹوں کے نام بھی میری طرح قدرے مشکل ہیں۔ چنانچہ آسانی کے لیے چھوٹے بیٹے کو چھوٹا تارڑ یعنی سی ٹی کہا جاتا ہے اور بڑے بیٹے کو بی ٹی یعنی بڑا تارڑ پکارا جاتا ہے۔ہمارے گھر میں مدتوں سے یہ ٹرمی نالوجی مستعمل ہے اور ہمہ وقت 'ابے او سی ٹی' اور 'اوئے بی ٹی کے بچے' وغیرہ کے آوازے لگتے ہیں۔ ہم نہایت اطمینان سے اپنے پیارے راج دلارے سی ٹی بی ٹی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے کہ یکدم پوری دنیا میں ہر جانب سی ٹی بی ٹی کا غل مچ گیا۔ ہم نے اس بات کا شدید طور پر برا مانا کہ بین الاقوامی برادری نے ہم سے پوچھا تک نہیں اور ہمارے بیٹوں کے نام چرا لیے ہیں۔ ٹیلیویژن پر پندرہویں ترمیم یکدم غائب ہو گئی ہے اور یکدم پوری قوم کو سی ٹی بی ٹی کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ہم امریکہ صاحب بہادر کی خوشنودی کے لیے اور اپنے آپ کو ڈیفالٹ سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ کر چکے ہیں بلکہ ہاتھ میں قلم لیے بیٹھے ہیں کہ بے شک سی ٹی بی ٹی کے علاوہ ڈی ٹی ای ٹی وغیرہ پر بھی دستخط کروا لو لیکن قوم کو اعتماد میں لینا بھی ضروری ہے چنانچہ قوم کو اعتماد میں لے کر کہا جا رہا ہے

کہ آپس کی بات ہے جو وہ کہیں گے وہی کرنا ہوگا۔البتہ بیان تو یہی دیں گے کہ ہم ایک غیور قوم ہیں ہم خود فیصلہ کریں گے کہ دستخط کرنے ہیں یا نہیں۔ جو کہ کرنے ہیں۔ جیسے ایک خاوند نے بیان دیا تھا کہ میں اپنی بیوی کا حکم ہرگز نہیں مانتا۔ آج وہ جھاڑو لے کر پیچھے دوڑی اور میں اس سے بچنے کے لیے پلنگ کے نیچے گھس گیا۔اس نے حکم دیا کہ باہر آجاؤ تو میں نے اس کا حکم نہیں مانا' بالکل باہر نہیں آیا۔اس طرح ہم بھی امریکہ کا حکم نہیں مانتے۔ بہرحال میں اور میری بیگم جو سی ٹی بی ٹی کے 'موجد' ہیں ہم سے پوچھا تک نہیں گیا اور ہمارے بچوں کے ناموں کو نامناسب مقامات پر ہماری اجازت کے بغیر استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا ٹریڈ مارک تھا جسے چرا لیا گیا ہے۔ بچے بھی بہت اپ سیٹ ہیں کیونکہ جونہی خبرنامے میں سی ٹی بی ٹی کہا جاتا ہے تو وہ دونوں اٹھ کر کہتے ہیں 'جی اباجی'۔اب انہیں اباجی کہنے سے تو نہیں روکا جا سکتا۔ دنیا میں اور اباجی بھی تو ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ موسم بدل رہا ہے۔

سیانے کہتے ہیں کہ ہر شے کا مزہ سردیوں میں آتا ہے۔ پتا نہیں ان ”اشیاء“ میں کون کون سے مزے شامل ہیں لیکن اہلِ لاہور کا خیال ہے کہ سردیوں میں ہی کھانے پینے کا لطف آتا ہے۔ پینے پر تو پابندی عائد ہو چکی ہے یعنی عوام الناس کے لیے۔البتہ خواص تک یہ خبر ابھی تک نہیں پہنچی۔ وہ تو کبھی اِدھر ڈوبتے ہیں اور اُدھر نکلتے ہیں اور کبھی ڈوبتے ہیں تو اگلی صبح کسی اور کے بستر میں سے نکلتے ہیں۔ پھر انہیں محبّ الوطن عناصر کی جانب سے اطلاع ملتی ہے کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد کیے جا رہے ہیں اور وہ فوراً بینکنگ ٹائم ختم ہونے کے باوجود کروڑوں ڈالر باہر منتقل کر دیتے ہیں۔ اہل لاہور کی خوش خوراکی مشہور ہے۔ خوراک جیسی بھی ہو وہ اسے خوش ہو کر کھاتے ہیں۔ گندے نالوں کے کنارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور غلیظ فٹ پاتھوں پر کرسیاں ڈالے وہ اپنی طرف سے نہایت اعلیٰ خوراکیں کھاتے ہیں۔ اتنا کھاتے ہیں کہ اہل لاہور کی بجائے نااہل لاہور ہو جاتے ہیں اور ووٹ بھی اس کو دیتے ہیں جو خوش خوراک ہوتا ہے۔ لاہور میں علم و دانش کے مرتبے پر بھی وہی حضرات فائز کیے جاتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ بہترین سری پائے کہاں پائے جاتے ہیں اور اعلیٰ پائے کے ہوتے ہیں۔ سیخ کباب میں کون اساتذہ کا درجہ رکھتا ہے۔ بلکہ لاہور کے ایک مشہور شاعر گام کبابیا تھے اور ظاہر ہے کباب فروش تھے' ان کا ایک مشہور مصرعہ گام کباب نہ بیچے تو کیا بیچے زبان زد عام ہے۔ اسی طور مٹھائی' بریانی' مرغ چنے' دال چاول' نہاری' بہاری کباب اور پکوڑوں وغیرہ کے ایکسپرٹ ہیں جنہوں نے ایسی خوراکوں

کی جستجو کے لیے زندگیاں وقف کر دیں۔ یہاں تک کہ زندگی کے آخری برس اسپتالوں میں بسر کیے۔ لاہوریئے صرف دیسی خوراکوں کے ہی شائق نہیں بلکہ آپ انہیں خوراک کے نام پر کچھ بھی کھلا سکتے ہیں۔ پچھلے برس یہاں ایک امریکی فاسٹ فوڈ ریستوران کھلا تو وہاں اتنا رش تھا کہ ٹریفک جام ہو گئی اور ہم نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو دربان کو رشوت دیتے دیکھا ہے کہ بھائی اگر میں نے آج ہی یہ برگر نہ کھایا تو مر جاؤں گا مجھے کسی نہ کسی طرح اندر پہنچا دو۔ ایک اور امریکی ریستوران جس کا نام 'چل ہٹ' سمجھ لیجئے اتنا پسندیدہ ہے کہ بیگمات باہر فٹ پاتھ پر پھسکڑے مار کر تب تک مونگ پھلی ٹھونگتی ہیں جب تک کہ دربان انہیں آواز نہ دے کہ بی بی ٹیبل خالی ہو گئی ہے آ جائیں۔

لاہور کے ایک بڑے چینی ریستوران کے مالک ایک روز شکایت کر رہے تھے کہ کارپوریشن' ایکسائز اور محکمۂ صحت والے اتنا تنگ کرتے ہیں۔ مفت میں خود بھی کھاتے ہیں اور محلے والوں کو بھی لے آتے ہیں اور پھر اسی خوراک کا چالان' بھی کر لیتے ہیں کہ یہ معیاری نہیں۔۔۔ میں نے کہا ''تو دفع کریں اس ریستوران کے کاروبار کو۔'' کہنے لگے ''آپ نے میرے ریستوران کے باہر جگہ کا انتظار کرتا ہجوم دیکھا ہے۔ لوگ کومنٹری سنتے رہتے ہیں۔ خواتین سویٹر بنتی رہتی ہیں لیکن چینی کھانا کھائے بغیر نہیں جاتے۔ دنیا کے کسی اور شہر میں ایسے گاہک نہیں ہیں۔ انہیں دیکھتا ہوں تو تکلیفیں بھول جاتا ہوں میں نے دبئی اور کینیڈا میں بھی چینی ریستوران کھول رکھے ہیں اور وہاں سے جو گھاٹا ہوتا ہے وہ لاہور والا ریستوران نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ منافع بھی دیتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ملک کے بقیہ شہروں میں چینی ریستورانوں کی کیا پوزیشن ہے؟ کہنے لگے اسلام آباد میں آپ چائے دانی میں چائے کے علاوہ کچھ اور سرو نہ کریں تو ریستوران نہیں چلتا۔ البتہ وہ بھولے لوگ ہیں آپ انہیں چینی خوراک کی بجائے کچھ بھی کھلا دیں کھا لیتے ہیں۔ اکثر اپنے پلے سے نہیں کھاتے۔ ایک گریڈ دوسرے گریڈ کو کھلاتا ہے۔ گریڈ اٹھارہ والا انیس کے بل ادا کرتا ہے اور انیس والا بیس کے بال بچوں کے نیپی بھی ڈنر کے دوران تبدیل کرتا ہے اور اتنی خوراک آرڈر کرتا ہے اور جان بوجھ کر کرتا ہے کہ گریڈ بیس اسے پیک کروا کے گھر بھی لے جاتا ہے۔ کراچی کراؤڈ ذرا انٹرنیشنل ہے اس لیے کھانے میں کیڑے بہت نکالتا ہے۔ چین میں تو ایسا چکن کورن سوپ نہیں ہوتا۔ سنگاپور میں تو ایسے چاول نہیں ہوتے وغیرہ۔''

گوجرانوالہ کے بارے میں یہ رپورٹ ملی ہے کہ وہاں لوگ فیشن کے لیے چینی

ریستوران میں آتے تو ہیں لیکن اپنے ساتھ بھنا ہوا قیمہ اور پراٹھے بھی باندھ کر لے آتے ہیں۔

میں نے شاید پہلے بھی تذکرہ کیا تھا اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میرے ایک ڈاکٹر دوست اپنی بیگم کے ہمراہ فیصل آباد کے ایک چینی ریستوران میں گئے۔ وہاں مینو پر ایک سپیشل ڈش کا نام 'سنگنگ چکن' یعنی گاتا ہوا مرغ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہایت متاثر ہوئے کہ جو شے پورے پاکستان میں نہیں کھائی آج فیصل آباد میں کھائیں گے چنانچہ ایک عدد سنگنگ چکن کا آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ویٹر طشتری میں ایک عام سا روسٹ چکن اٹھائے چلا آ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ چینی میں کوئی 'سن وے بلوری اکھ والیا' قسم کا کوئی گانا بلند آواز میں گاتا چلا آ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی سنگنگ چکن ہے۔۔ ویسے لاہور کی خوراکوں کو آپ کچھ بھی کہہ لیں ان میں ایک ایسا ذائقہ ضرور موجود ہے جو دنیا میں کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ اس ذائقے کی وجہ بے شک یہ ہوں کہ لاہور کے پانی میں اکثر گٹر کا پانی مکس ہو کر آتا ہے تو یہ اس کا کمال ہے۔ سری پایوں میں گائے بھینسوں کے علاوہ پتا نہیں کس کس کے پائے ہوتے ہیں اور کباب ایسے قیمے کے ہوتے ہیں کہ انہیں کھانے کے بعد بھونکنے کو جی چاہتا ہے۔

چند برس پیشتر دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو تاریخی مقامات دیکھنے کی خواہش کے پہلو بہ پہلو وہاں کی مشہور عالم خوراکوں کو بھی چکھنا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے ایک مسلم ہوٹل میں قیام ہوا۔ مالک سے پوچھا کہ بھئی یہاں دہلی کے خاص کھانے کہاں ملتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ حضور کہیں جانے کی ضرورت نہیں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس ایک سے بڑھ کر ایک باورچی ہے۔ لیکن فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تناول کرنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ شوق دا کوئی مل نئیں تو ہم بھی شوق کے مارے ہوئے کسی مغلائی گوشت کی دیگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ تو کیا بیان کریں کہ ہم پہ کیا گزری۔ ایک تو باورچی صاحب اتنے غلیظ کہ پسینہ پونچھ کر ضائع نہیں کرتے تھے دیگ میں چھڑک کر شوربے میں اضافہ کرتے تھے۔ بوٹیوں کی تلاش میں ہاتھ سے کام لیتے تھے اور گوشت جانے کس لگڑ بگڑ کا تھا معدے میں اترتے ہی گڑ بڑ کرنے لگا۔ اسی طرح کے چند دہلوی کھانے کھائے اور توبہ تائب ہو کر لاہور لوٹ آئے۔ ایک روز دہلی کی سیر کی اور سارا دن بھوکے رہے۔ واپسی پر ہوٹل کے نیچے جو دودھ دہی کی دکان تھی اس میں چلے گئے۔ گاہکوں کی نسبت چوہے زیادہ تعداد میں تھے اور کوئی مائنڈ نہیں کرتا تھا۔ مائنڈ تب کرتا تھا جب چوہا میز پر پھدک کر دودھ میں شریک ہونا چاہتا تھا اور اسے

'ہت تری کی' کہہ کر پیار سے بھگا دیا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کھانے کی بجائے لسی سے گزارہ کیا جائے چنانچہ ویٹر صاحب سے گزارش کی آدھ سیر دودھ اور آدھ سیر دہی کی لسّی بنا دیں اور اس میں وہ جو چھوٹی چھوٹی گولیاں ہیں اور جنہیں آپ پیڑے کہتے ہیں وہ بھی درجن بھر ڈال دیں۔ جب اس آرڈر کو پینتالیس منٹ گزر گئے تو میں نے ویٹر بھائی سے پوچھا کہ حضرت ہم پر بھی کچھ عنایت کر دیں۔ آرڈر کیوں نہیں لا رہے؟ وہ کہنے لگا صاحب بقیہ حضرات بھی تشریف لے آئیں تو حاضر کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے ہی بقیہ حضرات سمجھ لیں اور اب لے آئیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی گلاس لسّی تھی ویٹر ہمارے سر پر کھڑا رہا کہ یہ شخص اتنی لسّی پی رہا ہے تو یقیناً ابھی ابھی فوت ہو جائیگا۔

بہر حال موسم بدل رہا ہے۔

☆☆..........☆☆

"امنِ عامہ کی صورتِ حال قابلِ رشک ہوگئی ہے"

خلیفہ خلفشاری آئے اور حسب عادت اور حسب سابق قدرے خلفشار میں آئے بلکہ انتشار میں آئے اور آتے ہی کہنے لگے "لو بھئی تارڑ مبارک ہو......"

میں چوکنا ہو گیا کہ ہو نہ ہو خلیفہ بھی میرے بیشتر دوستوں اور محلے داروں کی طرح محترم محمد رفیق تارڑ کے صدر ہونے پر مبارکباد دینے آئے ہیں اس لیے کہ وہ بھی تارڑ ہیں......

"خیر مبارک......" میں نے فوراً کہا۔

"تم نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ میں مبارکباد کس بات کی دے رہا ہوں...... پوچھو کہ کس بات کی مبارکباد دے رہا ہوں۔" خلیفہ ذرا تنک کر بولے......

"جی تو میں پوچھتا ہوں کہ کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں؟"

"مبارک ہو کہ ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی سچوایشن ماشاءاللہ قابل رشک ہو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ...... مومن پورہ کو تو بھول جاؤ کہ ان غریبوں کا تو چالیسواں بھی گزر گیا اور اس کے ساتھ لیڈروں کے دعوے بھی گزر گئے کہ قاتل چوبیس گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لیے جائیں گے اور اس میں جو بیرونی ہاتھ ہے وہ ہم نے تلاش کر لیا ہے اور اب اس ہاتھ کی نمائش لاہور میوزیم میں ہو گی اور کل دنیا دیکھے گی کہ یہ کس کا ہاتھ ہے...... اور ہم آہستہ آہستہ ان بے قصور شہریوں کو بھی بھول جائیں گے جو شہر کراچی میں جانوروں کی طرح مار ڈالے گئے اور ابھی ان کے قاتلوں کی تلاش جاری ہے۔ اس دوران دو ایرانی کاریگر بھی ہلاک ہوئے اور لاہور کا ایک ڈاکٹر بھی...... جو نہایت ناعاقبت اندیش تھا اور چھوٹے چھوٹے بچے اور ایک عدد بیوہ چھوڑ کر مر گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ محلے کے شیعہ سنّی فرقوں

کی یکجہتی کا سب سے بڑا داعی تھا۔"

"خلیفہ...... ایک تو تم ہمیشہ بہکی بہکی باتیں کرتے ہو اور آج بھی اپنی دیرینہ روایت پر قائم ودائم ہو...... بات تو تم کر رہے تھے لاء اینڈ آرڈر کی سچوایشن کی' بہتری کی اور نکل گئے قتل اور ہلاکت کی جانب...... ویسے تو موت کا ایک دن متعین ہے اور اس میں واویلا کرنے کی کوئی بات نہیں کہ چند لوگ ہلاک ہو گئے...... اگر ہم واویلا کرتے ہیں تو اس کا صریحاً یہ مطلب ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے...... بھئی ان کی موت اسی طرح لکھی جا چکی تھی اس لیے اس میں قانون نافذ کرنے والے اداروں اور حکومت وقت کا تو کوئی دوش نہیں...... بلکہ ایسی اموات پر جو لوگ احتجاج کرتے ہیں انہیں فوری طور پر دائرۂ اسلام سے خارج کر دینا چاہیے...... لیکن یہ لاء اینڈ آرڈر سچوایشن کی بہتری کیسے ہو گئی......"

"بھئی اب تو مجرے ہو رہے ہیں۔"

"مجرا؟...... یعنی رقص وسرود وغیرہ؟ لاحول ولا...... تم کیسی باتیں کرتے ہو...... مملکت خداداد پاکستان میں......اور اسلام کے قلعے میں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایک تو تم ازل کے بھولے بادشاہ ہو...... بھئی مجرا ہماری روایت ہے...... محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔"

"لیکن زمانے تو بدل گئے ہیں خلیفہ خلفشاری......"

"ہمارا خیال ہے کہ زمانے بدل گئے ہیں......" خلیفہ پہلی بار دل کھول کر اور منہ کھول کر ہنسا۔ "اپنے پاکستان میں ایک عرصے سے...... بلکہ قائداعظم کی وفات سے لیکر اب تک محمد شاہ رنگیلے کا دور چل رہا ہے...... مجرے چل رہے ہیں۔ شرابیں چل رہی ہیں اور ابھی پچھلے دنوں "ہاٹ شاٹ کلب" اسلام آباد میں جو دو نوجوانوں کا قتل ہوا ہے وہاں بھی تو یہی کچھ ہوتا تھا اور صرف اہل ثروت اور اہل گھمنڈ کے لیے ہوتا تھا اور ایک انگریزی اخبار نے شاید غلطی سے یہ بھی رپورٹ کر دیا کہ اس کلب میں ملک کے مایۂ ناز سائنس دان عبدالقدیر کا بھی حصہ تھا۔"

"یہ اخبار والے یوں ہی بے پر کی اڑاتے ہیں...... بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عبدالقدیر خان......"

"میں خود نہیں مانتا...... رپورٹنگ غلط ہوتی ہے...... مجھے یقین ہے کہ چند ہی روز میں ان کی جانب سے بھرپور تردید آ جائے گی...... بھلا کہاں ایٹم بم اور کہاں ہاٹ شاٹ کلب......"

"یار خلیفہ...... تمہارا نام خلیفہ خلفشاری کی بجائے خلیفہ انتشاری ہونا چاہیے تھا...... بات تم کر رہے تھے کسی مجرے کی جو لاہور کے کسی شاندار علاقے میں دو باعزت خواتین کر رہی تھیں اور مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے وہاں مدعو نہیں کیا گیا تھا حالانکہ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں۔"

"تم جیسے دو ٹکے کے ادیبوں کو بھلا شرفا کی محفلوں میں مدعو کیا جا سکتا ہے؟ ہوش کے ناخن لو......"

"میں ہوش کے کتنے ناخن لوں......؟ فی الحال میرے پاس صرف بیس ناخن ہیں...... دس ہاتھوں کے اور دس پاؤں کے۔"

"میں سنجیدہ گفتگو کر رہا ہوں اور تم خبرنامے کے کسی نیوز کاسٹر کی طرح بے پر کی ہانک رہے ہو" خلیفہ ذرا خفا ہو گئے۔

"سوری۔" میں فوراً پشیمان ہو گیا "تو ایک مجرا ہو رہا تھا۔"

"ہاں تو مجرے کا کلائمکس یہ ہوا کہ ایک مکمل ہوش مند پولیس افسر...... نے جو کہ شبہ ہے لاہور میں ہی ایس پی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے خواتین سے نہایت مؤدب ہو کر درخواست کی کہ وہ اپنے کپڑے اتار دیں۔"

"لاحول ولا......"

"بھئی تم مجھے بات تو مکمل کر لینے دو...... تو ان خواتین نے جو قطعی طور پر حبیب جالب کے اس مصرعے سے ناواقف تھیں کہ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے جانے کیوں اس معصوم سی خواہش کو پورا کرنے سے انکار کر دیا...... یعنی تو جو ناواقف آداب شہنشاہی تھی...... تو ان کی غیرت کو جوش آ گیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔"

"ایس پی صاحب کو انکار کر دیا...... توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ کوئی کنچنی کوتوال شہر کے سامنے یہ جرأت کرے...... یہ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں خلیفہ...... کپڑوں کا کیا ہے ادھر اتارا ادھر پہن لیے...... توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"تم میری بات سنتے کیوں نہیں؟" خلیفہ جوش میں آ گئے "بیچ میں واہی تباہی بکتے چلے جا رہے ہو......"

"سوری...... اب کے اگر میں بولوں تو جو اُن کی سزا جنہوں نے سپریم کورٹ آف پاکستان کی تختیاں ادھیڑ کر اس پر حملہ کیا تھا بس وہی میری سزا......"

"تو جناب مجرا کرنے والی خواتین نے اس ایس پی صاحب کے حکم کی تعمیل کرنے

سے انکار کر دیا اور اس پر قابل فہم طور پر ایس پی صاحب طیش میں آگئے اور اپنے سروس ریوالور کے ساتھ فائرنگ شروع کر دی......لوگ تتر بتر ہو گئے اور ان رقاصاؤں کی بیوقوفی کی وجہ سے خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے یعنی ایس پی صاحب نے اپنے تردیدی بیان میں کہا ہے جو ان کے نوکری سے معطل کر دینے کے بعد آیا ہے کہ وہ قطعی طور پر اس محفل میں شریک نہیں تھے اور یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی اور یہ ہوائی اتنی اونچی اڑی کہ اخباروں نے اچک لی......اور اس کا مقصد صرف ان کی شہرت کو نقصان پہنچانا اور ان کے خاندان کو بدنام کرنا ہے......"

"تو پھر انہیں معطل کیوں کیا گیا......"

"اسی بات کا تو رونا ہے......اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ موصوف اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے لیے وہاں یونہی اتفاق سے موجود تھے تو بھی غفلت ان خواتین کی تھی جنہوں نے ایک معصوم سی خواہش کی تکمیل سے انکار کیا اور یوں لاء اینڈ آرڈر سچوایشن پیدا کر دی۔ حالانکہ تارڑ میاں سب جانتے ہیں کہ ان خواتین کی کیا عزت ہوتی ہے جو بے عزتی ہو جائے اور پولیس سروس آف پاکستان کے ایک معزز رکن کی بس عزت ہی تو ہوتی ہے جسے وہ سینت سینت کر رکھتا ہے......چنانچہ شروع میں میں نے جو مبارکباد دی تھی وہ اسی بات کی دی تھی۔ اگرچہ ملک میں قانون کی حکمرانی بہتر ہو گئی ہے لیکن کچھ شرپسند اور مخرب الاخلاق لوگ اس میں خلل ڈال رہے ہیں......"

"خلیفہ اس ایک باوقار تقریب کے حوالے سے تم نے یہ بیان دے دیا کہ ملک میں قانون کی صورتحال بہتر ہو گئی ہے؟"

"نہیں......ایک اور نہایت دردناک قصہ بھی ہے 'وہ بھی سن لو' لاہور سے ایک فلائٹ پی کے 386 اسلام آباد جا رہی تھی......یہاں بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کو قانون نافذ کرنے سے روکا گیا......"

"کس نے روکا؟"

"لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس ملک محمد قیوم نے......"

"خلیفہ اب تم ہوش کے ناخن لو......بھلا عدلیہ کے ایک محترم منصف قانون کے نفاذ کو کس طرح روک سکتے ہیں؟"

خلیفہ یکدم بھڑک اٹھے "اے مرد ناداں تو میری بات کو مکمل کیوں نہیں ہونے دیتا۔"
میں نے یکدم ایک اطاعت گزار پلّے کی طرح کان نیچے کر لیے "سوری......"

"تو جسٹس صاحب لاہور سے اسلام آباد جانے کے لیے ایئرپورٹ پر پہنچے......فلائٹ کی تاخیر کا اعلان ہونے لگا اور دو گھنٹے تک ہوتا رہا......جسٹس صاحب ذرا تاؤ کھا گئے اور انہوں نے ایئرپورٹ منیجر کو طلب کیا۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ دراصل وزیراعظم پاکستان کے صاحبزادے حسین نواز اسی فلائٹ پر سفر کرنا چاہ رہے ہیں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قومی ایئرلائن کا جہاز ان کے بغیر روانہ ہو جائے اس لیے سینکڑوں عوام الناس اتنے بیتاب نہ ہوں۔ وہ آئیں گے تو جہاز چلے گا......اور ابھی پتہ نہیں کہ وہ کب آئیں گے......"

"خلیفہ......تم بے شک مجھے زدوکوب کر لو لیکن......ایئرپورٹ منیجر نے کوئی غلط بیان تو نہیں دیا......شاید حسین نواز کو شیو کرتے ہوئے دیر ہو گئی ہو یا......اپنی ٹائی کا رنگ پسند کرتے ہوئے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی ہو تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کا انتظار نہ کیا جائے......کم از کم رائے ونڈ کے فارم پر ان کے گھوڑے آصف زرداری کے گھوڑوں کی طرح چاکلیٹ تو نہیں کھاتے......"

"یقیناً یہ ایک قابل تحسین بات ہے لیکن اس کے باوجود جسٹس صاحب تاؤ میں آگئے اور انہوں نے ایئرپورٹ پر ہی کچہری لگائی۔ حسین نواز کی وجہ سے فلائٹ کو تین گھنٹے تک روکنے کے الزام میں ایئرپورٹ منیجر کو معطل کر دیا......"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر اپنے چودھری شجاعت صاحب کی درخواست پر جسٹس صاحب نے معطلی کے احکامات واپس لے لیے لیکن منیجر صاحب کو اپنی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا......"

"درست کیا......شاید انہیں سپریم کورٹ کا واقعہ یاد تھا......اور وہ تو صرف ہائیکورٹ تھے۔"

"تارڑ میاں......اسی لیے تو میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ملک میں لاء اینڈ آرڈر سچوایشن ماشاءاللہ قابل رشک ہو گئی ہے......اور یہ صرف عوام الناس ہیں جن میں رقاصائیں بھی شامل ہیں اور عدلیہ ہے جو اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے ورنہ......وہ بات مان لیتیں اور جسٹس صاحب تین گھنٹے انتظار کر لیتے تو ان کا کیا بگڑتا......"

☆☆☆

"نقل کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے......"

ہمارے ہاں صدیوں سے ایسے محاورے اور مقولے رائج ہیں جو قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہیں اور کبھی کسی نے ان پر غور کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ کم از کم ان زمانوں میں تو ان کا کوئی جواز نہیں...... مثلاً ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا...... یوں تو کسی بھی ٹیڑھے یا سیدھے آنگن میں ناچنا ہی ایک بیہودہ حرکت ہے۔ بندے کو ناچنا ہو تو سیاست کی اسٹیج پر ناچے جس کا کوئی ٹیڑھا سیدھا ہوتا ہی نہیں اور بے شک ناچ نہ جانتا ہو تب بھی ناچے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی نے میرے ناچنے پر اعتراض کیا تو مارشل لاء لگ جائے گا...... یوں بھی ہمارے بیشتر پاپ سنگر ناچ نہیں جانتے تب بھی سٹیج پر ناچتے ہیں اور انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی کہ سٹیج ٹیڑھا ہے...... ناچ کے حوالے سے ہی کہا جاتا ہے کہ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔ اول تو یہ سراسر غیر اسلامی محاورہ ہے اور اس پر شریعت کورٹ کی رولنگ آسکتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ بے چاری رادھا ان زمانوں میں نو من تیل کا کرے گی کیا...... سٹور کہاں کرے گی...... اگر رادھا کو نو من تیل کی بجائے آٹے کا ایک تھیلا عنایت کر دیا جائے تو وہ مارے تشکر کے ناچ ناچ کے ناک میں دم کر دے گی۔ اسی طرح محاورہ ہے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے۔ جن صاحب نے یہ محاورہ گھڑا تھا انہیں شاید کبھی اندھا ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کیونکہ انسان خدانخواستہ اندھا ہو جائے تو اسے کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ البتہ اس کی بجائے اگر یہ کہا جاتا کہ اقتدار کے اندھے کو اقتدار اقتدار ہی سوجھتا ہے تو یہ درست ہوتا......

ہمارے ہاں بے شمار ایسے سیاست دان ہیں جو اگر ایک تانگہ لے کر نکلیں تو ان کی سواریاں بھی پوری نہ ہوں گی۔ اور اس کے باوجود کسی بھی منتخب حکومت کے بارے میں

پیشگوئیاں کرتے رہیں گے کہ بس یہ گئی کہ گئی...... زیادہ سے زیادہ چھ مہینے نکالے گی...... بد قسمتی سے ان بربادی کے پیغمبروں کی ایسی پیش گوئیاں اکثر درست ثابت ہوتی ہیں اور پھر وہ جمہوریت کے استحکام کے لیے کسی نگراں حکومت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے سیاست دان جب اقتدار سے نکل جاتے ہیں تب بھی ان کو اقتدار ہی سوجھتا ہے...... یہ نہایت کائیاں قسم کے اندھے ہوتے ہیں جو عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور عوام اتنے بھولے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے پہلے آنکھیں بچھاتے ہیں اور پھر انہیں کھول کر کہتے ہیں کہ لیجئے صاحب دھول جھونکئے......

یہ کہاوت بھی خاصی مستعمل ہے کہ نقل اصل کے مطابق نہیں ہوتی...... کیوں نہیں ہوتی؟ بالکل ہوتی ہے 'اگر آپ امتحانی مرکز میں اپنے سامنے کتاب کھول کر نقل کریں تو جناب بالکل اصل کے مطابق ہوتی ہے 'اگر آپ کو یقین نہ آئے تو بیشک کوئٹہ کے اس تعلیمی ادارے کے ذہین فطین طلبہ سے پوچھ لیجئے جو اس عمل کے چمپئن ہیں۔ ان شاہین بچوں کے ساتھ بے حد زیادتی کی گئی اور اڑنے سے پہلے ہی (امتحان میں اڑنے سے پہلے) ان کی پرواز میں خلل ڈالا گیا...... یہ خلل ڈالنے والے ان کے نالائق ممتحن تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ نقل مطابق اصل ہوتی ہے...... ان ہونہار بروا کے پات اتنے چکنے چکنے تھے کہ ممتحن حضرات نے ان کے پاتوں پر قدم رکھا تو پھسل پھسل گئے...... ہمارے یہ جینئس طلبہ کمرۂ امتحان میں اپنے آگے سلیبس کی کتابیں کھولے بڑی مشکل سے نقل کر رہے تھے کہ وہاں تعینات عملے نے ایک نہایت بیہودہ اعتراض کر دیا کہ جی آپ بے شک چوری چھپے یہ عمل جاری رکھیں لیکن یوں دن دہاڑے کتابیں کھول کر نقل تو نہ کریں...... طلبہ نے انہیں پہلے تو نہایت شائستگی سے سمجھایا کہ میاں ان دنوں لفظوں کے ہجے نہایت اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں اور اگر دیکھ کر نہیں لکھیں گے تو غلطی کا احتمال ہے اور اگر غلطی ہو جائے تو آپ لوگ ہی واویلا کرتے ہیں کہ جی ملک میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے۔ ہم ذرا تعلیم کا معیار بلند کرنا چاہتے ہیں تو آپ اعتراض کرتے ہیں...... اس پر اساتذہ نے پھر گزارش کی کہ عزیز طلبہ آپ باز آجائیں لیکن عزیز طلبہ نے کہا کہ ہم باز کیسے آجائیں ہم تو باز بننا چاہتے ہیں یعنی اقبال کے شاہین کا عملی روپ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں...... چونکہ اساتذہ اقبال کے فلسفہ خودی سے ناواقف تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ شاہین بچے اپنی خودی کو بلند کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اس لیے انہوں نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ عزیز طلبہ طیش میں آگئے...... ممتحن حضرات کی مناسب گوشمالی کی اور کمرۂ امتحان سے

واک آؤٹ کر گئے۔ شنید ہے کہ وائس چانسلر صاحب نے ان نوجوانوں سے مذاکرات کیے اور انہیں دوبارہ امتحان دینے پر مائل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تو تاریخ میں ہوتا آیا ہے کہ ظالم پسے ہوئے عوام کے حقوق سلب کرتا ہے اور پھر ان سے مذاکرات کرتا ہے اور یہ ہونہار نوجوان اس چال سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وائس چانسلر کچھ ہوش کی دوا کریں بھلا کتابیں سامنے نہ رکھی جائیں تو امتحان دینا کیسے ممکن ہو سکتا ہے...... کتاب میں بھی وہی لکھا ہے جو ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم ہرگز کمرۂ امتحان میں نہ بیٹھیں گے' ایک تو آپ کی گزارش پر ہم امتحان کے کمرے میں جائیں اور پھر نقل بھی نہ کر سکیں یہ کیسے ممکن ہے...... چونکہ یہ نہایت مناسب استدلال تھا اس لیے وائس چانسلر کے ساتھ معاہدہ ہو گیا کہ جی نقل کی اجازت سرکاری طور پر تو نہیں ہو گی البتہ آپ تھوڑی بہت نقل ضرور کر لیں۔ کتاب کھول کر دیکھ لیں اور پھر اسے بند کر کے ڈیسک کے نیچے رکھ دیں لیکن ڈیسک کے اوپر نہ رکھیں۔

چنانچہ چند دنوں بعد پھر امتحانوں کا انعقاد ہوا...... اور اس گارنٹی کے ساتھ کہ آپ تھوڑی بہت نقل کر سکتے ہیں...... عزیز طلبہ کو تھوڑی بہت نقل کی عادت نہ تھی' ان کے لیے یہ ذرا واہیات سا طریقہ تھا کہ کتاب کھول کر دیکھو پھر اس عبارت کو یاد رکھو اور کتاب بند کر کے ڈیسک کے نیچے رکھو اور پھر پیپر پر لکھو۔ اتنی دیر میں تو افلاطون بھی بھول جائے چنانچہ انہوں نے پھر براہ راست نقل بازی شروع کر دی' اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر انہیں منع کیا گیا تو وہ پھر واک آؤٹ کر جائیں گے۔ وائس چانسلر صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر زیادتی کی اور امتحان ملتوی کر دیا اور بیان دیا کہ میں نقل کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا اور اس پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ عزیز طلبہ وائس چانسلر اور دیگر اساتذہ کے ساتھ ہلکی پھلکی بدتمیزی کے بعد جلوس نکال رہے ہیں اور مظاہرے کر رہے ہیں اور اپنے مطالبات کے بارے میں نہایت واضح ہیں یعنی ایک جلوس کے شرکاء نعرے لگا رہے تھے کہ نقل کی اجازت کے بغیر امتحان نہیں دیں گے اور ایک بینر پر جلی حروف میں یہ مطالبہ لکھا ہوا تھا کہ "نقل کرنا ہمارا حق ہے"...... مجھے امید ہے کہ انہیں اب تک کسی سیاسی اور سماجی دباؤ کے تحت یہ حق مل چکا ہو گا اور اپنی خودی کے ساتھ ملک میں تعلیم کا معیار بھی بلند کر چکے ہوں گے۔

نقل ہمارے زمانے میں بھی ہوتی تھی' ابھی تک "بُوٹی" کا بامعنی لفظ ایجاد نہیں ہوا تھا یعنی بوٹی چلانا۔ بوٹیاں لے جانا' بوٹی مافیا وغیرہ وغیرہ...... امتحانی مراکز کی

خرید و فروخت کا منافع بخش کاروبار ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ صرف اور صرف ازحد نالائق بچہ لوگ نقل کرتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ گھگھی بندھی ہوئی ہے' آواز نہیں نکل رہی' تن بدن میں لرزہ طاری ہے اور وہ ہتھیلی کھولتے ہیں جس پر دو چار سوال لکھ کر لائے ہیں اور وہ سوال مٹھی میں آنے والے پسینے کی وجہ سے معدوم ہو چکے ہیں۔ پھر آگے بیٹھے ہوئے کلاس فیلو کی منت سماجت ہو رہی ہے کہ...... اوئے تو یار نہیں میرا...... خدا کے لیے بتا دو کہ یہ خطہ ٹنڈرہ کہاں ہے اور یہ فیثا غورث' واسکوڈی گاما کا کیا لگتا تھا اور اس کا مسئلہ کیا تھا...... تجھے آلو چھولے کھلاؤں گا' بنٹے والی بوتل پلاؤں گا اور رنگین چاک دوں گا' بتا دے میرے سوہنے ویر...... اور وہ سوہنا ویر جس کی پسلیوں میں آپ اپنے پین سے کچوکے دے رہے ہیں وہ بھی لرز رہا ہے کہ کہیں ماسٹر صاحب نہ دیکھ لیں اور کہہ رہا ہے...... اوئے مروا نہ دینا...... میرا خیال ہے ٹنڈورہ تو ٹینڈے کی کوئی قسم ہے اور یہ فیثا غورث ہمیشہ کسی بات پر غور کرتا رہتا تھا۔ پتہ نہیں کس بات پر' اور واسکوڈی گاما میرا خیال ہے گاما پہلوان کا ماما تھا...... دراصل ان دنوں طلبہ کو اپنے حقوق کا شعور نہ تھا......

ہمارا ایک کلاس فیلو تھا بھائیا نثار...... موصوف ایک عرصے سے نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ چار پانچ برس تک کورس کی کتابوں کی چھان پھٹک کرتے رہے لیکن کچھ پلّے نہ پڑا کہ ان میں ہے کیا...... ہر سالانہ امتحان کے خاتمے پر روشنائی کی دوات کو کسی دیوار پر بازو گھما کر پھینکتے اور اسے توڑ دیتے اور پھر اعلان کرتے "اوئے اب تو ہم جماعت دہم کے طالب علم ہو گئے ہیں" اور ہر بار دوسرے لوگ تو جماعت دہم کے طالب علم ہو جاتے اور وہ بازار سے ایک نئی دوات خرید لاتے اور جماعت نہم کے اسی ڈیسک پر جا بیٹھتے جس پر پچھلے کئی برسوں سے بیٹھ رہے تھے۔ "بھائیا" کا خطاب انہیں اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ہم جماعتوں سے عمر میں کہیں بڑے ہو چکے تھے اور باقاعدہ شیو کرتے تھے۔ کلاس میں اکثر دیر سے آتے اور آتے ہی اعلان کرتے "میں شیو کر رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔" ہم سب بے حد متاثر ہوتے کیونکہ ابھی تک ہم قدرتی طور پر بالکل صفاچٹ تھے اور دور دور تک صاحب ریش ہونے کا امکان نہ تھا...... بھائیا نثار چونکہ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اسکول فنڈ میں کھلے دل سے چندہ دیتے اور ماسٹر صاحبان بھی ان سے بہت خوش تھے بلکہ انہیں نثار صاحب کہتے تھے کیونکہ وہ انہیں آدھی چھٹی کے موقع پر کینٹین سے شربت چہار مغز پلایا کرتے تھے...... ان دنوں ٹیوشن کا قطعی طور پر رواج نہ تھا لیکن جب بھائیا نثار کے ہم عمر کالج میں پہنچ کر ایم اے پاس کرنے لگے تو انہوں نے ایک ماسٹر صاحب جنہیں ہم اپنی سہولت کے

لیے ماسٹر علم دین کہہ سکتے ہیں کے ساتھ مذاکرات کیے اور ان سے انگریزی کی ٹیوشن پڑھنے لگے۔ سالانہ امتحان سر پر آئے تو بھائیا نثار نے کھلے دل سے اقرار کیا کہ ماسٹر صاحب...... ٹھیک ہے آپ مجھے پچھلے چھ ماہ سے پڑھا رہے ہیں لیکن مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ آپ پیپر سیٹ کرتے ہیں' مجھے پیپر بتا دیجئے...... ماسٹر علم دین بے حد شاکڈ ہوئے اور کہنے لگے کہ نہیں نثار صاحب یہ تو بے ایمانی ہے...... اس پر بھائیا نثار کہنے لگے 'ماسٹر صاحب آپ جانتے ہیں کہ انگریزی وغیرہ میرے بس کی بات نہیں۔ پچھلے چھ برس سے فیل ہو رہا ہوں تو یہ بے ایمانی نہیں ہے کہ آپ مجھ سے ٹیوشن فیس وصول کرتے رہے ہیں...... اگر آپ نے مجھے پیپر نہ بتایا تو میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کر دوں گا کہ آپ نے تو وعدہ ہی یہی کیا تھا کہ بچہ ٹیوشن کے پیسے دے دو میں تمہیں پیپر بتا دوں گا...... اس پر ماسٹر علم دین پر لرزہ طاری ہو گیا اور انہوں نے پیپر بتا دیا کہ یہ مضمون آئے گا' یہ گرائمر آئے گی...... بھائیا نثار نے کہا' نہ جی پورا پیپر مجھے حل کر کے دیں تا کہ میں یاد کر لوں...... ماسٹر صاحب بے چارے پھنس چکے تھے انہوں نے مکمل پرچہ حل کر کے اپنے شاگرد رشید کے حوالے کر دیا...... اس حل شدہ پیپر کو یاد کرنا بھی شاگرد رشید کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ وہ اسے جوں کا توں کمرۂ امتحان میں لے گئے اور وہاں اس پرچے کو امتحانی شیٹ پر نقل کرنا بھی ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے وہ ماسٹر علم دین کے ہاتھ کے حل کردہ پرچے کے اوپر اپنا نام لکھ کر ممتحن کے حوالے کر آئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ماسٹر علم دین کی ہینڈ رائٹنگ پہچانی گئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کو نوٹس دے دیا اور بھائیا نثار پھر فیل ہو گئے۔

کاش بھائیا نثار ان زمانوں میں ہوتا تو میں اسے فوراً کوئٹہ بھیج دیتا جہاں ہمارے شاہین بچے "نقل کرنا ہمارا حق ہے" کے پھریرے لہرا رہے ہیں اور وہ یقیناً وہاں پاس ہو جاتا...... ویسے میں کوئٹہ کے طالب علموں کے مطالبے کے حق میں ہوں' انہیں سپورٹ کرتا ہوں کیونکہ جب تک اصل سامنے نہ ہو نقل اس کے مطابق کیسے ہو سکتی ہے...... اور تعلیم کا معیار خودی کے ساتھ ساتھ کیسے بلند ہو سکتا ہے...... "نقل کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے......"

☆☆☆

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہر میں صلیب پر مارا جانے والا نو برس کا بچہ"

کبھی کبھار برسوں بعد ایک تصویر اخباروں میں چھپتی ہے اور وہ پوری تاریخ بیان کر دیتی ہے...... صرف ایک تصویر...... بلکہ سیاسی مبصروں کے تجزیئے 'لیڈروں کے بیان' بے شمار قربانیاں اور تاریخ کی ان گنت کتابیں اور شاعروں کے دیوان بھی وہ کچھ بیان نہیں کر سکتے اور صرف ایک تصویر دنیا بھر کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے...... اگر اس دنیا کا کوئی ضمیر ہے تو......

ایک تصویر جنگ ویت نام کی تھی...... ایک سپاہی ایک ویت نامی گوریلے کی کنپٹی پر پستول کی نالی جمائے اسے شوٹ کرنے کو ہے...... آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے اس گوریلے کے چہرے پر جہاں موت کی وحشت ہے وہاں ایک عجیب ٹھہراؤ اور سکون بھی ہے...... اسی جنگ کی ایک اور تصویر تھی کہ ایک بدھ بھکشو شہر کے وسط میں ایک سڑک پر اطمینان سے براجمان شعلوں کی لپیٹ میں ہے وہ اس خونی جنگ کے خلاف اپنے آپ پر مٹی کا تیل چھڑک کر احتجاج کر رہا ہے تا کہ دنیا کا ضمیر متوجہ ہو۔ لیکن سب سے پر اثر اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی وہ تصویر تھی جس میں امریکی طیاروں سے پھینکے گئے ہلاکت خیز نیپام بموں کے شعلوں میں۔ سے ایک چھ' سات برس کی ویت نامی بچی جس کے بدن پر کچھ نہیں روتی ہوئی بھاگ رہی ہے...... جنگ ویت نام کے خاتمے میں ان تین تصویروں کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔

ایک تصویر ایتھوپیا کے قحط کی ہے...... ایک سیاہ ڈھانچہ جو کہ ایک بچہ ہے مٹی

میں گرے گندم کے دانوں کو تلاش کر رہا ہے اور اس کے نزدیک چند بچے مرے پڑے ہیں اور ذرا فاصلے پر ایک گدھ منتظر ہے...... اس تصویر نے بھی وہ کچھ کہا جو دنیا بھر کے اخبار نہ کہہ سکے......

ایک اور تصویر بوسنیا کے ایک تاحد نظر پھیلے قبرستان کی ہے جس میں ہزاروں مسلمان شہیدوں کی سفید قبریں ہیں اور ایک بچی اپنی ماں کی قبر پر ایک پھول رکھ رہی ہے......

کشمیر کی ایک نہیں کئی تصویریں ہیں...... ان میں سے ایک میں ایک کشمیری خاتون اپنے بیٹے کی لاش پر کھڑی ماتم کر رہی ہے...... ایک اور تصویر میں ایک چوبی مکان کی کھڑکی کا ایک کواڑ کھلا ہے اور اس میں سے جھانکتا ہوا ایک خوفزدہ چہرہ ہے ایک نوجوان لڑکی کا...... اور ہندوستانی سپاہی گاؤں کو نذر آتش کر رہے ہیں۔

بغداد کے ایک تہہ خانے میں پناہ لینے والے بچوں اور عورتوں کی ایک تصویر ہے...... دور تک ان کی لاشیں سفید کفنوں میں لپٹی دکھائی دے رہی ہیں۔

آج ان تصویروں کو میری یاد کے نہاں خانوں میں سے تلاش کر کے ایک مرتبہ پھر میری نظروں کے سامنے لانے والی وہ تصویر ہے جو آج کے اخبار میں چھپی ہے۔ یہ فلسطین کی تصویر ہے...... بے گھر، جلاوطن اور کبھی اپنے گھر میں قید اور غلام فلسطین کی کئی تصویریں ایسی ہیں جنھوں نے اداسی اور بے بسی کے کئی نقش ذہن پر کندہ کیے...... جتنا بڑا ظلم ہو، جتنے بے حساب برسوں پر وہ محیط ہو ظاہر ہے اس کی تصویروں کی تعداد بھی اسی حساب سے ہوتی ہے...... کبھی شتیلا کیمپ میں اسرائیلی طیاروں کی بمباری میں بھاگتے ہوئے خون آلود چھوٹے چھوٹے بچے...... کبھی متعدد فوجیوں کی تانی ہوئی سب مشین گنوں کے سامنے صرف ایک چھوٹا سا بچہ پتھر اٹھائے ہوئے...... اور کبھی اپنا آبائی مکان بلڈوز ہوتے دیکھ کر ایک خاندان کی بے بسی اور اس کے آنسو...... کوئی ایک تصویر ہے جو فلسطین کے ظلم کو بیان کرتی ہے۔ ان تمام تصویروں میں...... اکثر تصویروں میں ایک قدر مشترک ہے...... ظلم کا شکار بچے ہیں......

اور آج جو تصویر اخباروں میں چھپی ہے وہ بھی ایک بچے کی ہے۔ ایک مردہ بچے کی...... نو برس کے علی جوارش کی...... اس کی فلسطینی پرچم میں لپٹی ہوئی لاش کو قبرستان لے جایا جا رہا ہے۔ علی جوارش کا چہرہ ڈھکا ہوا نہیں ہے...... اس کے ماتھے پر کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا کہ وہ ایک فلسطینی بچہ ہے وہ ایک پاکستانی، ایک عراقی، ایک چینی یا ترک بچہ بھی ہو سکتا ہے...... البتہ وہ ایک یورپی یا امریکی بچہ نہیں ہو سکتا...... کسی کی جرأت نہیں کہ وہ ایک یورپی یا

امریکی بچے کو مار سکے کیونکہ یہ وہ ہیں جو صرف دوسروں کے بچے مارتے ہیں...... ہاں اس کے ماتھے پر کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا کہ وہ ایک فلسطینی بچہ ہے البتہ اس کے ماتھے پر ایک زخم کا چھوٹا سا نشان دکھائی دیتا ہے جس کے راستے ایک اسرائیلی فوجی کی گولی اس کے دماغ کے اندر گئی وہ چار روز بے ہوش پڑا رہا اور پھر مر گیا۔ علی جوارش نے تو اپنے ہاتھ میں کوئی پتھر بھی نہیں اٹھایا تھا وہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا جب اسے شوٹ کر دیا گیا...... اور اس کے باپ نے اپنے بیٹے کی قربانی کو یوں ایک مثال بنا دیا کہ اس نے ایک مقامی اسپتال سے کہا کہ وہ اس کے بچے کے جسم کے ایسے حصے نکال لے جو کسی اور مرتے ہوئے بچے کے جسم میں لگا کر اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے...... اور مثال یوں قائم کی کہ اس کے بیٹے کے بدن کے حصے وصول کرنے والا صرف عرب بچہ ہی نہیں ہو سکتا اگر ایک اسرائیلی بچہ مر رہا ہے تو بے شک وہ بھی حقدار ہوگا...... اس کے باپ محمد نے اسے قبرستان لے جاتے ہوئے اور روتے اور آہ وزاری کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنے بچے کے بدن کے حصے ایک مذہبی فریضے کے طور پر بخشے ہیں، مجھے یہ غرض نہیں ہے کہ وہ کسی عرب بچے یا اسرئیلی بچے کو ملتے ہیں...... صرف اس بچے کو زندہ رہنا چاہیے۔"

صرف اس بچے کو زندہ رہنا چاہیے...... کس باپ کا اتنا جگرا ہے کہ وہ اپنے جگر گوشے کا بدن اس کے قاتلوں کے بچوں کے لیے وقف کر دے...... یہ حوصلہ، یہ ظرف صرف ایک فلسطینی باپ کا ہی ہو سکتا ہے...... کوئی ایک مثال، کوئی ایک حوالہ کہیں امریکہ سے، یورپ سے، تہذیب کے ان خداؤں سے، ذرا تلاش کیجیے...... وہاں کا پبلک اوپینین تو کہتا ہے کہ عراق کے خلاف پابندیاں ہمیشہ کے لیے ہونی چاہئیں بے شک اس دوران لاکھوں عراقی بچے دوائیاں نہ ملنے کے باعث مر چکے ہیں۔ بغداد کو بومب کر کے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دو کیونکہ صدام کی یہ جرأت کہ وہ امریکی شہریت رکھنے والے انسپکٹروں پر اعتراض کرے...... کیا یہ محض اتفاق ہے کہ امریکہ کی ہٹ لسٹ پر جو ملک ہیں ایران، عراق اور لیبیا یہ اسم محمد کے نام لیوا ہیں...... کیا یہ محض اتفاق ہے...... اگرچہ یہ اتفاق نہیں کہ نو برس کے سید علی جوارش کے جنازے پر لوگوں نے "صدام، صدام ہمارے پیارے تل ابیب پر حملہ کرو۔" کے نعرے لگا رہے تھے...... میں نے کل شب ایک مزاحیہ انگریزی فلم دیکھی جسے پاکستان سنسر بورڈ نے بخوشی نمائش کی اجازت دی ہے "فیئرس کریچرز" اس فلم میں ایک چڑیا گھر دکھایا گیا ہے جس میں صرف خونخوار جانور رکھے گئے ہیں اور ان کے ایک پنجرے پر سب سے "خونخوار جانور" صدام حسین کی ایک تصویر ہے جسے آخر میں کوڑے کرکٹ کے ساتھ

جلادیا جاتا ہے۔ صدر صدام سے میرا کوئی واسطہ نہیں...... اس نے اگر کویت پر حملہ کیا تو اس نے میرے دل میں کوئی جگہ نہ بنائی' میں اس کے لیے خاص طور پر کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتا...... لیکن اس کے باوجود جب اس فلم میں وہ تصویر جلائی جاتی ہے اور جب کوڑے کرکٹ میں انگریزی میں لکھا ہوا نام ''حسین'' جلتا ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے...... یہ ''حسین'' میرے نام کا بھی ایک حصہ ہے اور اس فلم کو پاکستان سنسر بورڈ نے بخوشی نمائش کے قابل قرار دیا ہے' کسی ایک شخص کی پالیسی کی سزا اس کی قوم کو تو نہیں دینی چاہیے...... کسی ایک حسین سے اگر اختلاف ہے تو سب حسینوں کو تو جلانا نہیں چاہیے......

دنیا میں آج جتنا تشدد ہے' جتنی مار کٹائی ہے اس کا آغاز اس لمحے سے ہوتا ہے جب فلسطینیوں کو ان کے وطن سے نکال کر وہاں ایک ایسی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں چند ایک کے سوا سب شہری دنیا بھر کے ملکوں سے ''امپورٹ'' کیے گئے تھے...... ان شہریوں کو اس ملک کی مٹی میں لگاؤ نہ تھا وہ صرف ایک بہتر مستقبل اور ایک مذہبی جنون کے تحت یہاں آئے تھے اور ان کی پشت پر سپر پاورز کی تھپکی تھی...... جب مصر نے ''جنگ رمضان'' یا ''حرب تشرین'' کا آغاز کیا اور اسرائیلی مورچوں کو تباہ کرکے صحرائے سینا میں دور تک نکل گئے اور پھر جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور وہ ہارنے لگے تو صدر سادات نے کہا تھا ''ہم اسرائیل سے جنگ جیت سکتے ہیں لیکن امریکہ سے نہیں جیت سکتے''...... جب فلسطینی بے گھر ہوئے اور ان کی داد فریاد پر کسی نے کان نہ دھرا...... تب مجبوراً انہوں نے ہتھیار اٹھائے...... لیلیٰ خالد اور اس کے ساتھیوں نے یورپی ہوائی جہاز اغوا کرکے انہیں تباہ کردیا یہاں سے ہائی جیکنگ کا آغاز ہوا...... میں 1975ء میں بیروت میں موجود تھا جب وہاں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر اطالیہ جانے والے ایک بحری جہاز پر سوار ہوا...... بیروت میں میں نے فلسطینیوں کے کیمپ دیکھے۔ کیمپ کیا تھے شہر کے شہر تھے' عارضی ٹین کے گھروں اور خیموں میں بے گھر فلسطینیوں کا وہ حال دیکھا جسے دیکھ کر بندوق اٹھانے کو جی چاہتا تھا۔ آج کی بیشتر نسل ان کیمپوں میں پیدا ہوئی' وہیں جوان ہوئی اور وہیں مر رہی ہے اور کوئی انہیں انصاف نہیں دیتا...... یہ مفروضہ درست نہیں ہے کہ اگر آپ کا راستہ سچائی کا ہو تو ہمیشہ حق کی فتح ہوتی ہے۔ فلسطینیوں کے لیے یہ مفروضہ سچ ثابت نہیں ہوا...... فتح صرف طاقت کی ہوتی ہے اور صرف لوگوں کا دل بہلانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ سچائی اور حق بالآخر فتح یاب ہوں گے...... یاسر عرفات ایسے نڈر' جنگجو بھی تھک ہار کر صلح کی میز پر آ بیٹھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس اپنے عقیدے اور اپنی سرزمین کا سچ تو ہے

لیکن طاقت نہیں ہے اور اب وہ ایک ایسے جال میں پھنس چکا ہے جس میں سے وہ اگر نکلنا بھی چاہے تو نہیں نکل سکتا...... محمود درویش ایسے باکمال شاعر نے اپنے فلسطین کے ایسے ایسے نوحے لکھے ہیں کہ پتھروں کا سینہ بھی شق ہو جائے لیکن یہ نوحہ گری بھی کچھ کام نہ آئی...... میری بیگم جب بھی خبرنامے میں اسرائیلی سپاہیوں کو عورتوں اور بچوں کو زدوکوب کرتے ہوئے دیکھتی ہے' ان کے گھر مسمار کرتے ہوئے دیکھتی ہے' نوجوانوں کے جنازے دیکھتی ہے تو ہمیشہ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ کیوں دکھایا جارہا ہے' ان کی بے بسی اور رسوائی کو کیوں نشر کیا جارہا ہے جب کہ کسی کو بھی ان کی پرواہ نہیں۔ کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا...... ہم ایمل کانسی اور یوسف رمزی کو ان کے حوالے کردیتے ہیں تاکہ انصاف کیا جاسکے اور وہ بھی ان کی عدالتوں میں لیکن اس معصوم علی جوارش کے قاتلوں کو پکڑنے کے لیے کوئی سی آئی اے' کوئی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس حرکت میں نہیں آتا...... اگر ایک یہودی مسجد ابراہیمی میں داخل ہو کر چالیس' پچاس نمازیوں کو ہلاک کردیتا ہے تو اسے صرف ایک ''جنونی'' کہا جاتا ہے اور اگر ایک فلسطینی اپنی زمین کی حفاظت کے لیے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھاتا ہے تو وہ ''دہشت پسند'' ہے...... اگر چین میں حکومت سے اختلاف رکھنے کے جرم میں ایک وی جنگ شنگ نامی شخص قید ہے تو یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور چین اور امریکہ کے تعلقات خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اسے نوبل امن پرائز کے لیے نامزد کیا جاتا ہے...... اور ایک نو برس کے فلسطینی بچے کو ماتھے پر گولی مار کر ہلاک کردیا جاتا ہے تو وہ یقیناً ایسی ہی موت کے لائق تھا کیونکہ وہ دہشت پسند تھا اور اگر اس کا باپ اپنے بیٹے کے بدن کو کسی قریب المرگ اسرائیلی بچے کے لیے وقف کردیتا ہے تو یہ اس اسرائیلی بچے کا حق تھا...... غلام ہمیشہ مالکوں کے لیے اپنی جانیں نثار کرتے آئے ہیں۔

چنانچہ کبھی کبھار برسوں بعد ایک تصویر اخباروں میں چھپتی ہے اور وہ پوری تاریخ بیان کردیتی ہے۔

کسی ایک نو برس کے بچے کی جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہر بیت اللحم میں فلسطینی پرچم میں کفنا کر قبرستان لے جایا جارہا ہے...... اور اس کے ماتھے پر یہ نہیں لکھا ہوا کہ اس کا وطن کون سا ہے اس لیے کہ اس کا کوئی وطن نہیں...... لیکن میں غور سے دیکھتا ہوں تو اس کے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ...... میں تمہارا بچہ ہوں۔

☆☆☆

”میری ”بے عزتی“ خراب ہوتی جارہی ہے!“

خواتین و حضرات میں چاہتا ہوں کہ میری بے عزتی خراب نہ ہو۔

اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے نہ ہو...... کیونکہ ہر روز یہ بے عزتی خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی بجلی کا بل کر دیتا ہے‘ کبھی ہمسائیوں کا کوئی کتا کر دیتا ہے...... کبھی دوست کر دیتے ہیں اور کبھی سیاستدان کر دیتے ہیں اور ہاں کبھی امریکہ کر دیتا ہے کہ یہ پاکستانی اپنی ماؤں کو بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ تو میں بے عزتی کی مسلسل خرابی سے تنگ آچکا ہوں اور ذرا معزز ہونا چاہتا ہوں۔

یوں تو معاشرے میں میری عزت کا گراف اسی روز گر گیا تھا جب میں نے ادب اور ٹیلی ویژن کو اپنی زندگی کے دھارے میں شامل کیا تھا اور اسی کے ساتھ بہہ گیا تھا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے بھی عزت درکار ہے...... لیکن میں کیا کروں‘ اس کے حصول کا کوئی تیر بہدف نسخہ دریافت نہیں کر سکا۔ ایسے تمام تر نسخے جاگیرداروں‘ سرمایہ داروں‘ بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کے پاس ہیں اور وہ انہیں ہوا نہیں لگنے دیتے اور مجھ ایسے مڈل کلاسئے کو تو وہ قطعی طور پر درخور اعتنا نہیں سمجھتے...... یہ عزت اور وقار بھی عجیب و غریب اشیاء ہیں۔ ان دونوں کے لیے تاریخ میں جتنی قتل و غارت ہوئی ہے‘ اتنی زن‘ زر اور زمین کے لیے بھی نہیں ہوئی۔ انگریز ہمیشہ فرانسیسیوں پر چوٹ کرتے تھے کہ فرانسیسی تو ہمیشہ دولت کے لیے میدان جنگ میں اترتے ہیں جبکہ ہم صرف عزت کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں اور فرانسیسیوں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ جس کے پاس جس چیز کی کمی ہو‘ وہ اسی کے لیے لڑتا ہے...... چنانچہ میں نے بھی اپنی عزت کے حصول کے لیے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا کہ میں لڑوں تو

کس سے لڑوں...... اور میں کس قسم کی عزت چاہتا ہوں...... میرے والد کے دوستوں میں ایک کریم صاحب ہوا کرتے تھے اور مقامی سطح پر زبردست سیاست کرتے تھے۔ الیکشن میں ہمیشہ کامیاب ہوتے تھے اور اس کے بعد لوگوں کے کام کروانے میں بھی ان کا جواب نہ تھا...... ایک بار والد صاحب نے پوچھا ”کریم صاحب آخر آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟“

کریم صاحب ہنس کر بولے...... ”آپ دوست ہیں‘ آپ کو بتائے دیتے ہیں...... لیکن کسی اور کو نہ بتائیے گا‘ وعدہ کریں۔“ والد صاحب نے وعدہ کر لیا تو وہ کہنے لگے۔ ”میری کامیابی کا راز ہے ٹوپی ڈرامہ......“

”ٹوپی ڈرامہ؟“ والد صاحب نے نہایت حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا...... یاد رہے کہ کریم صاحب اس زمانے کے بیشتر سیاستدانوں کی طرح ہمیشہ اچکن اور جناح کیپ میں ملبوس رہتے تھے۔ ”یہ کس قسم کا ڈرامہ ہے۔“

”جناب چودھری صاحب...... یہ نہ تو شیکسپیئر کا ڈرامہ ہے اور نہ کالی داس کا بلکہ یہ اس دنیا میں کامیابی اور عزت حاصل کرنے کا ڈرامہ ہے...... جب الیکشن نزدیک آتے ہیں تو میں ہر گاؤں میں جو سب سے موثر اور طاقتور شخص ہوتا ہے‘ اس کا انتخاب کرتا ہوں کیونکہ ایسے شخص ظاہر ہے ہر دو چار برس میں بدل جاتے ہیں۔ کبھی گاؤں کا نمبردار ہوتا ہے‘ کبھی پٹواری ہوتا ہے۔ کبھی کوئی زمیندار اور کبھی کوئی نودولتیا...... میں الیکشن سے پیشتر اس کے پاس جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جناب چودھری صاحب ذرا میری بات تو سن لیں الگ ہو کر...... جب ہم دونوں اکیلے ہوتے ہیں تو میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں کہ میرے بھائی‘ میرے دوست‘ میرے محترم‘ میرے آقا۔ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے...... تمہارے گاؤں کے ووٹ مجھے درکار ہیں ورنہ میں بے عزت ہو جاؤں گا اور پھر میں اپنی ٹوپی اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا ہوں اور پیچھے ہٹ کر پھر سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ وہ شخص آبدیدہ ہو جاتا ہے اور وعدہ کر لیتا ہے‘ چاہے جان چلی جائے کریم صاحب...... آپ کے ووٹ کہیں نہیں جائیں گے اور میں ٹوپی اٹھا کر باہر آجاتا ہوں۔“

”یعنی وہ آپ جو ٹوپی اس کے پاؤں میں رکھتے ہیں‘ وہی دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیتے ہیں کریم صاحب؟“ والد صاحب مزید حیرت زدہ ہوئے۔

”نہیں چودھری صاحب‘ میں اتنا بھولا نہیں ہوں...... میں جب کبھی ایسے مشن کے بعد باہر آتا ہوں تو ٹوپی میرے ہاتھ میں ہوتی ہے اور گھر آکر صندوق میں سٹور شدہ درجنوں ٹوپیوں میں سے ایک نئی نکور ٹوپی سر پر رکھتا ہوں اور کسی اور نمبردار کی طرف نکل جاتا ہوں۔“

"لیکن دوسروں کے پاؤں میں رکھی جانے والی ٹوپیوں کا کرتے کیا ہیں؟"

"اپنے ملازموں کو دے دیتا ہوں...... آپ نے غور نہیں کیا؟"

والد صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ڈرائیور سے لے کر کھیت میں کام کرنے والے ان کے مزدوروں نے بھی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔

میں نے ذاتی طور پر اس ٹوپی ڈرامے کو بھی حصول عزت کے لیے اپنانے کا سوچا کیونکہ میں تو خود ڈرامے کا آدمی ہوں لیکن اس میں قباحت صرف اتنی ہے کہ بے شک میرے ننگے سر کو شیطان ٹھونگے مارتا ہے لیکن میں ٹوپی نہیں پہنتا...... اور اب اگر میں ٹوپی پہننا شروع کر دوں تو یونہی مخدوش سا لگوں گا اور یوں بھی میرے پاس اتنے ملازم نہیں ہیں کہ روزانہ پانچ چھ ٹوپیاں انہیں پہنا دوں...... زیادہ سے زیادہ ایک ٹوپی اپنے پارٹ ٹائم مالی کو دے سکتا ہوں یا دودھ والے کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں......

عزت بچانے کے لیے میں اپنے ایک شناسا حکیم صاحب کا نسخہ بھی استعمال کر سکتا ہوں...... حکیم صاحب نہایت سوشل اور پاپولر شخصیت ہیں...... حکمت کم کرتے ہیں اور حکمت کی باتیں زیادہ کرتے ہیں کہ اس میں کوئی حکمت ہو گی اور کھانے کے ازحد شوقین ہیں...... یعنی دوسرے کے پلّے سے کھانے کے...... مجھے یاد نہیں کہ آج تک انہوں نے اپنے پلّے سے کسی کو انار کا ایک دانہ بھی کھلایا ہو لیکن ہر دعوت میں موجود ہوتے ہیں اور وہاں جو کھانا ہوتا ہے' اسے وہ اپنا آخری کھانا سمجھ کر کھاتے ہیں۔ پچھلے اتوار ایک دوست کے ہاں مرغ بریانی کی دعوت تھی...... مرغ تو حکیم صاحب نے اڑائے اور بریانی بقیہ مہمانوں نے کھائی...... کھانے کے بعد وہ تین گھنٹے تک بیٹھے رہتے ہیں کیونکہ اٹھ نہیں سکتے۔ اس محفل میں ایک صاحب نے تہیہ کر لیا کہ آج وہ حکیم صاحب سے اگلی دعوت کا وعدہ لے کر ہی اٹھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا' حکیم صاحب کچھ تو شرم کریں۔ کبھی ہمیں بھی تو موقع دیں کہ ہم آپ کے گھر آئیں۔ بے شک پانی پلا دیجئے گا لیکن اگلے اتوار دعوت آپ کے ہاں ہو گی...... اب حکیم صاحب کا جواب کچھ یوں تھا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں ہو گی...... دوستوں کے لیے تو میں جان بھی قربان کر دوں...... آپ حکم کریں اور میں تعمیل نہ کروں توبہ توبہ...... دعوت آپ سے اچھی ہے...... آپ اگلے اتوار کہتے ہیں' میں تو ہر اتوار دعوت دینے کو تیار ہوں...... آپ حکم کریں۔"

"تو پھر اگلے اتوار آپ کے ہاں دعوت طے ہے؟" ان صاحب نے خوش ہو کر کہا کہ کام بن گیا......

"دراصل آپ کی بھابھی امید سے ہیں۔ انہیں ڈاکٹر نے اور میں نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے تو یہ چھوٹی سی پرابلم ہے"...... اگرچہ ہم لوگ یہ خوب جانتے تھے کہ حکیم صاحب اپنی بیگم کو کسی قسم کی امید سے رکھنے کی سٹیج سے گزر چکے تھے لیکن اب ان کے گھر جا کر ہم چیک تو نہیں کر سکتے تھے...... اس پر وہ صاحب کہنے لگے "تو چلئے یوں کرتے ہیں کہ مزنگ میں ایک تنور ہے جہاں گل بہار نانوں کی دعوت ہو سکتی ہے۔"

"گل بہار نانوں!" حکیم صاحب چونک کر کہنے لگے۔ "اچھا نانوں...... لیکن قیمے والے نانوں میں قیمے کی کوالٹی مخدوش سی ہوتی ہے' آپ کا پیٹ خراب ہو جائے گا......"

اب یہاں بھی مسئلہ پیٹ کا تھا لیکن ان صاحب نے ہتھیار نہ ڈالے۔ "ہو جائے پیٹ خراب' ہم آپ سے آپ کا سپیشل فوری فرحت چورن خرید کر کھالیں گے۔"

"چورن تو ختم ہو گیا ہے۔ اگلے برس بناؤں گا تو پھر سہی۔"

ہم باہر گئے تو میں نے حکیم صاحب پر ترس کھاتے ہوئے کہا "حکیم صاحب آپ اتنے معزز شخص ہیں...... دو چار سو روپے کی بات تھی کھلا دیتے نان...... کیوں بے عزت ہوتے ہیں؟"

ہنس کر کہنے لگا۔ "بے عزت ہی ہوئے ناں...... بے عزتی خراب تو نہیں ہوئی۔"

حکیم صاحب کا یہ نسخہ بندہ بے شک بے عزت ہو جائے لیکن بے عزتی خراب نہ ہو بھی میرے لیے کار آمد نہیں ہو سکتا کیونکہ...... نہ میں اپنی بیگم کی امید کا بہانہ بنا سکتا ہوں اور نہ میرے پاس فوری فرحت چورن ہے تو پھر میری عزت کیسے بحال ہو جو خراب ہو چکی ہے۔

اور بھلا ہو میرے عزیز دوست صدیق چودھری کا کہ اسی شام اس نے میرا یہ مسئلہ فوری طور پر حل کر دیا۔ "تم چاہتے ہو کہ تم باعزت ہو جاؤ...... جہاں سے گزرو' وہاں وہاں کے لوگ تمہیں رشک بھری اور عزت بھری نگاہوں سے دیکھیں...... یہی چاہتے ہو ناں؟"

"بالکل یہی چاہتا ہوں...... تم جلدی سے کوئی طریقہ بتاؤ......"

"تم ایک موبائل ٹیلی فون حاصل کر لو اور......"

"ٹھہرو ٹھہرو...... میرے گھر میں فون ہے اور مجھے موبائل کی ہرگز ضرورت نہیں......"

"تمہارا کیا خیال ہے' یہ جو ہزاروں لوگ اسے ایک نوزائیدہ بچے کی طرح سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ کمرے میں داخل ہو کر سلام بعد میں کرتے ہیں اور موبائل آپ کی میز پر پہلے رکھتے ہیں...... یہ کاروں اور موٹر سائیکلوں پر سوار مسلسل اس پر باتیں کرتے ہیں تو ان سب کو اس کی ضرورت ہے؟"

"ٹھیک ہے لیکن......"

"تم ٹیلی ویژن سٹیشن جاتے ہو تو وہاں ہر ابھرنے والی یا اچھی طرح سے ابھر چکی نوخیز اداکارہ کے ہاتھ میں موبائل نہیں ہوتا۔ ادھر موبائل پر کوئی ایمرجنسی ڈیکلیئر ہوتی ہے اور ادھر وہ اداکارہ یہ کہہ کر کہ میری نانی جان کی طبیعت خراب ہے' ڈرامے سے واک آؤٹ کر جاتی ہے۔"

"چلو موبائل حاصل کر لیتا ہوں۔ اپنی عزت کے لیے کیا نہیں کرنا پڑتا اور اس کے علاوہ؟"

"بس ایک موبائل رکھ لو اور دو مسلّح گارڈ رکھ لو...... بس یہی ہے عزت حاصل کرنے کا شارٹ کٹ۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے صدیق چودھری...... چلو موبائل تک تو سوچا جا سکتا ہے لیکن یار میری جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ نہ میں کسی مذہبی تنظیم کا سرگرم رکن ہوں۔ نہ میں کسی مسجد کا امام ہوں اور نہ ہی میرا پیپلز پارٹی' مسلم لیگ یا ایم کیو ایم سے کوئی اختلاف ہے۔ مسلح گارڈ کیوں رکھوں؟"

"عزت کے لیے...... معاشرے میں وقار حاصل کرنے کے لیے...... بے شک تمہیں جان کا خطرہ نہیں لیکن جب تم اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ کہیں جاؤ گے تو ہر جانب لوگ "پرے ہٹو پرے ہٹو' تارڑ آ رہا ہے" کے نعرے لگائیں گے۔ دہشت زدہ ہو کر تمہاری عزت کریں گے کہ یہ شخص یقیناً اس ملک کی ایک ممتاز شخصیت ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں موبائل ہے اور اس کی جان کو بھی خطرہ ہے اور یقیناً اس سے کسی اور کی جان کو بھی خطرہ ہے...... تو میرے عزیز...... عزت کروانی ہے تو صرف ایک موبائل اور دو مسلح گارڈز۔"

اب میں سوچ رہا ہوں کہ عزت کے حصول کے لیے کیسے ایک موبائل حاصل کروں کہ مجھ میں تو موجودہ فون کا بل ادا کرنے کی سکت نہیں ہوتی اور مسلح گارڈ پتہ نہیں کتنے میں ملتے ہیں؟ کہاں سے اور کس بھاؤ ملتے ہیں...... اور اگر میں انہیں کرائے پر حاصل کر بھی لوں تو انہیں کار میں کہاں بٹھاؤں گا...... ان کو بٹھاؤں گا یا اپنے بال بچوں کو بٹھاؤں گا...... آپ کا کیا خیال ہے' باعزت ہونے کے لیے یہ سب کچھ کر گزروں یا حسب سابق اپنی بے عزتی خراب کرواتا رہوں؟

☆☆☆

"میں دوپٹہ اوڑھ کر ہرگز کمپیئرنگ نہیں کرونگا......!"

"یار پالیسی آ گئی ہے۔" معراج پتھر دھم سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر متعدد ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور لگتا تھا کہ یہ ہوائیاں کسی دشمن نے اڑائی تھیں۔

"معراج گھر میں تو سب خیریت ہے ناں۔ کوئی بچہ گٹر میں تو نہیں گرا...... کسی بچے نے پتنگ لوٹتے لوٹتے نیچے صحن میں قلابازی تو نہیں لگا دی...... کیا ہوا ہے؟"

"پالیسی آ گئی ہے......" اس نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

"کونسی پالیسی؟...... آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی تو اس ملک میں آ نہیں سکتی...... فارن پالیسی ہم خود نہیں بناتے بلکہ مالک بنا کر دیتے ہیں اور ہمارے وزیر خارجہ گوہر ایوب خان لاہور کے شاہی قلعہ میں ملکہ عالیہ کا استقبال کرتے ہوئے انہیں اپنے کف لنکس دکھاتے ہیں......"

"کف لنکس ملکہ عالیہ کو دکھاتے ہیں......" معراج نے اپنے چہرے پر اڑنے والی ایک ہوائی کو گال پر چپت لگا کر ہلاک کیا اور مزید پریشان ہو کر بولا "لیکن کیوں؟"

"وزیر خارجہ نے اپنے کف لنکس کو نہایت فخر سے ملکہ عالیہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ یور میجسٹی یہ کف لنکس آپ نے پچھلے دورے کے دوران میرے والد صاحب کو پیش کیے تھے......"

"یار میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ پالیسی آ گئی ہے اور تم مجھے رائل کف لنکس کے قصے سناتے ہو......" اس نے ناراض ہو کر کہا......

"کس قسم کی پالیسی آگئی ہے معراج پتر؟"

"ٹیلی ویژن پالیسی۔"

"پھر آگئی ہے؟"

"سنا ہے دوپٹہ پھر آرہا ہے۔"

"کونسا دوپٹہ...... کس رنگ کا دوپٹہ...... مورا لال دوپٹہ ململ کا یا کوئی اور دوپٹہ؟"

"ایک تو تمہاری مراث پنے کی یہ عادت نہیں جاتی' آخر ٹیلی ویژن پر کام کرتے ہو طبلہ نوازوں اور سارنگی بجانے والوں کی صحبت میں بیٹھتے ہو تو یہی ہو گا......اچھے بھلے زمینداروں کے بیٹے تھے اور اب پیشہ ور ہو گئے ہو...... بھئی سنا ہے کہ ہر کس و ناکس کو دوپٹہ اوڑھ کر ٹیلی ویژن پر آنا پڑے گا......"

"میں ٹیلی ویژن چھوڑ دوں گا لیکن دوپٹہ اوڑھ کر کمپیئرنگ نہیں کروں گا۔" میں نے اعلان کر دیا۔

"یار میں خواتین کی بات کر رہا ہوں......اس کے علاوہ شادی سے پہلے محبت نہیں دکھائی جائے گی۔ اگر یہ کہنا ہے کہ جان مجھے تم سے محبت ہے تو شادی کے بعد کہہ سکتے ہیں......"

"آج تک کس بے وقوف نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ جان مجھے تم سے محبت ہے...... شادی کے بعد تو یوں بھی جان نکلی ہوتی ہے......اس کا مطلب ہے کہ ساری کی ساری شاعری بھی گئی۔ میں نے تو آج تک کوئی ایسا شعر نہیں پڑھا جس میں شاعر نے کہا ہو کہ زوجہ محترمہ...... ہمیں تم سے محبت ہے صنم......یا یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں......اور ساری کی ساری لوک داستانیں بھی گئیں' نہ ہیر کی شادی ہوئی تھی اور نہ صاحباں کی......بلکہ ہیر نے تو باقاعدہ گڑبڑ کی تھی یعنی سَیدے کھیڑے کے ساتھ شادی کے بعد بھی رانجھے سے ملتی تھی......"

"اور وہ سٹیج پر دھا دھم کودنے والے پاپ سنگرز بھی گئے...... ان پر بھی پابندی لگ گئی ہے......"

"اس پابندی کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہو گا...... میں اس عمر میں اگر کودنا بھی چاہوں تو صرف کنوئیں میں کود سکتا ہوں......دھا دھم کودنے کی کوشش کروں گا تو ریڑھ کی ہڈی آگے پیچھے ہو جائے گی یا ٹخنے میں ایک نہیں متعدد موچیں آجائیں گی......"

"لیکن یار...... یہ سب کے سب پاپ والے اتنے پاپی تو نہیں......"دل دل

پاکستان" ایک قومی عوامی ترانے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے......کونسی ایسی بس ہے یا ٹرک ہے جس کے پیچھے دل دل پاکستان نہیں لکھا ہوا...... یہ لڑکے دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں ہندوستانی بھی دل دل پاکستان کی فرمائش کرتے ہیں......اور جنید جمشید کے بال بھی اتنے لمبے نہیں......اور اس کا کیا ذکر کہ ہمارے تمہارے بزرگ اور اللہ سے لو لگانے والوں کے بال بھی لمبے ہوتے تھے......وارث شاہ اور میاں محمد کے بال تو کندھوں تک آتے تھے......ادھر جنون کا وہ نغمہ "جذبہ جنوں" تو ایسا ہے کہ وہ سیاچن کے محاذ پر جا کر ہمارے مجاہدوں کو سناتے ہیں تو وہ اللہ اکبر کے نعرے لگانے لگتے ہیں اور پھر ان لوگوں نے اپنی لوک شاعری اور لوک داستانوں کو بھی اس نئی نسل کے ڈرائنگ رومز تک پہنچایا ہے جو صرف انگریزی گانے سنتے تھے' اللہ تعالیٰ کی حمد بھی گاتے ہیں......یوں تو "پاپی پپیہا رے پی پی نہ بول بیری"...... کو بھی بین کر دینا چاہیے کیونکہ اس میں بھی جو پپیہا ہے' وہ پاپی ہے یعنی پاپ سنگر ہے......"

"لیکن معراج یہ جو پاپ کے نام پر دھما چوکڑی مچتی ہے...... کرسیاں چلنے لگتی ہیں......خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی جاتی ہے' اس کا بھی تو کوئی سدباب ہونا چاہیے......"

"بالکل درست......ان میں سے ایسے بھی ہیں جن کے گلے میں سُر نہیں' بالوں میں جوئیں زیادہ ہیں اور اسی لیے وہ بے چارے جوؤں سے لاچار ہو کر بال جھٹکتے ہیں اور خوفناک آوازیں نکالتے ہیں...... ٹیلی ویژن سٹیشن کے باہر ایک سرکاری حجام بٹھانا چاہیے جو ان کے بال کاٹے' انہیں جوؤں اور خشکی سے نجات دلائے تو پھر یہ بالکل تندرست ہو کر بے شک اندر چلے جائیں...... لیکن سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے...... تم بھی تو اس قسم کے میوزیکل شوز میں ملوث رہے ہو؟"

"ہاں ایک بار مجھے ایک عوامی قسم کا میوزیکل شو کمپیئر کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے عرض کیا کہ جناب میری ایک شرط ہے...... شو کے دوران دھما چوکڑی نہ مچائی جائے اور نہ عوام الناس نعرے لگاتے ہوئے سٹیج پر رقص کرنے لگیں۔ پروڈیوسر صاحب کہنے لگے کہ بھئی اگر کوئی شخص موسیقی سے وجد میں آجائے تو اسے تو ہم نہیں روک سکتے...... میں نے کہا' آپ فکر نہ کریں۔ وجد میں آنے والوں کو میں سنبھال لوں گا...... چنانچہ شو شروع کرنے سے قبل میں نے حاضرین سے گزارش کی کہ محترم حاضرین...... موسیقی صرف سننے کی چیز ہے' بے شک سر ہلائیے' جھومئے لیکن آپ میں سے اگر کسی نے اسٹیج کے سامنے آکر دھمال وغیرہ ڈالنے کی کوشش کی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا...... خیر یہ تو نہیں کہا تھا کہ ٹانگیں توڑ دوں

گا لیکن جو کچھ میں نے باادب ہو کر کہا' اس کا سلیس اردو میں مطلب یہی نکلتا تھا...... شو کا آغاز ہوا...... حاضرین موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے اور نہایت شرافت سے لطف اندوز ہوتے رہے اور پھر میں نے دیکھا کہ ہمارے ٹیلی ویژن کے ایک ملازم حاضرین کو غیرت دلوانے کے لیے ان کے سامنے رقص کرنے لگے...... لوگوں نے انہیں دیکھا تو وہ بھی اس دھاچوکڑی میں شامل ہو گئے...... شو کے بعد میں نے ذرا غصے سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی؟ وہ کہنے لگے 'سر جی یہ پالیسی ہے...... آپ کا شو ضرورت سے زیادہ پرامن تھا' ہم نے اسے پالیسی کے مطابق بنا دیا...... آخر ہم نے بھی تو نوکری کرنی ہے...... چنانچہ ٹی وی والے کیا کریں' انہوں نے بھی نوکری کرنی ہے حکومت وقت کی...... اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ کسی شو میں یہی صاحب خواتین کے سروں کو دوپٹوں سے ڈھانپتے نظر آئیں گے کیونکہ...... نوکری تو کرنی ہے اور پالیسی کے مطابق کرنی ہے۔"

"ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم میانہ روی کیوں اختیار نہیں کر سکتے...... یہ آتے ہیں تو یکدم اظہر لودھی آ جاتے ہیں اور ایک نہایت پیاری مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہیں کہ خبرنامہ حاضر ہے...... سبحان اللہ' آج نیوز کا سیٹ کتنا سادہ اور ایمان افروز ہے کیونکہ میاں صاحب آ گئے ہیں...... حالانکہ ایک نیوز کاسٹر کا کیا کام کہ وہ قومی خبرنامے میں اپنی سیاسی وابستگیوں کا اعلان کرتا پھرے...... اور اس کے ساتھ دوپٹے آ جاتے ہیں۔ محبت پر پابندی لگ جاتی ہے...... اور جب وہ آتے ہیں تو ہر طرف بھگدڑ سی مچ جاتی ہے۔ کپڑے کم پڑ جاتے ہیں' بدن زیادہ ہو جاتے ہیں...... کیمپیئر ہاتھ ہلا ہلا کر پرندے ہو جاتے ہیں' کیمروں کے نیچے کیلے کے چھلکے آ جاتے ہیں اور وہ کسی ایک منظر پر ٹکتے ہی نہیں۔ اگر ٹکتے ہیں تو جھومتے چلے جاتے ہیں...... شوز میں لوگ ناچنے لگتے ہیں اور ہر طرف دمادم مست قلندر ہونے لگتی ہے...... ہم کوئے یار سے نکلتے ہیں تو سیدھے سوئے دار چلے جاتے ہیں۔ راہ میں کوئی اور مقام جچتا ہی نہیں......"

"ویسے کوئے یار والے کونسے ہیں اور سوئے دار والے کونسے ہیں؟"

"خیر اب تم اتنے بھولے بھی نہیں۔" معراج پتھر مسکرانے لگا۔ "یہ آتے ہیں تو دمادم مست...... غائب ہو جاتا ہے اور صرف قلندر باقی رہ جاتا ہے اور اگر کبھی جماعت اسلامی آ گئی تو قلندر بھی گیا...... ویسے یار یہ ٹی وی پالیسی ہوتی کیا ہے؟"

"یہ تو مشاہد حسین ہی بتا سکتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جب جنرل ضیاء الحق طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہوئے تو صبح کی

نشریات کی میزبانی ان دنوں میرے سپرد تھی...... وفات کے تیسرے دن ہمیں بتایا گیا کہ اب ان کے نام کے ساتھ "شہید" بھی آئے گا۔ یہ ابھی ابھی فیصلہ ہوا ہے...... تو اسے پالیسی کہتے ہیں...... اسی طور جب سرخ پوش لیڈر خان عبدالغفار خان فوت ہوئے تو بھی میں ڈیوٹی پر تھا۔ یکدم میرے پروڈیوسر سٹوڈیو میں آئے اور کہنے لگے۔ "یہ جو پروگرام آن ایئر جا رہا ہے' اس کے اختتام میں صرف ایک منٹ باقی ہے۔ پھر آپ آن ایئر ہوں گے تو ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ غفار خان فوت ہو گئے ہیں تو ان کی موت کی خبر اناؤنس کر دیجئے...... میں نے اس چٹ کو ایک نظر دیکھا جس پر یہ اطلاع درج تھی اور اسی لمحے پروڈیوسر سٹوڈیو سے باہر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے کیونکہ میں آن ایئر جانے کو تھا۔ "جناب آپ یہ تو بتاتے جائیں کہ خان صاحب کی وفات کی خبر سنانے کے بعد "اناللہ......" پڑھنا ہے یا نہیں؟" میں نے انہیں تقریباً چیخ کر روکا...... وہ رکے اور مخمصے میں پڑ گئے کیونکہ ولی خان ابھی حکومت میں شامل نہیں تھے اور ان کے خاندان کے بارے میں سرکاری شکوک پائے جاتے تھے...... پھر پروڈیوسر صاحب نے سر جھٹکا...... اور کہا' بس جو جی میں آئے کریں...... اسی لمحے کیمرے کی سرخ بتی آن ہو گئی اور میں نے خان صاحب کی وفات کی خبر سنانے کے بعد اپنے رسک پر...... "اناللہ......" پڑھ دیا...... تو یہ ہوتی ہے پالیسی......"

"تو پھر یہ چمن یونہی رہے گا......؟"

"ہاں یہ چمن بدقسمتی سے یونہی رہے گا...... معراج پتھر جب میں بہت چھوٹا تھا تو میں بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا جو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ میری نانی جان کھانے سے پہلے میرے بائیں ہاتھ پر اپنا دوپٹہ باندھ دیتی تھیں اور میں مجبوراً دائیں ہاتھ سے کھانا کھا لیتا تھا۔ کئی بار جب وہ میرا ہاتھ باندھنا بھول جاتیں تو میں اپنا بایاں ہاتھ آگے کر کے کہتا' نانی جان اس پر دوپٹہ باندھ دیں' مجھے کھانا کھانا ہے...... کچھ اس طور پر ٹیلی ویژن سٹیشن کے باہر دوپٹوں کا بندوبست ہونا چاہیے کہ جب بھی کوئی پاپ سنگر آئے' اسے باندھ دیا جائے اور کہا جائے کہ اب اندر جا کر اچھل کود کے بغیر بندے کے پتر کی طرح گاؤ......"

"یہ تو کوئی حل نہ ہوا......" معراج پتھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اس کا...... ٹی وی پالیسی کا تب تک کوئی حل نہیں ہو سکتا جب تک ہم کوئے یار اور سوئے دار کے درمیان میں کسی مقام پر ٹھہر نہیں جاتے...... دمادم اور مست قلندر کے درمیان۔"

☆☆☆

”میر تقی میر کو دھواں گوشت بہت پسند تھا......“

رُت بدل رہی ہے۔

کیسے بدل رہی ہے؟ اگر میں رومانی جذبات میں نچڑنے والے ناول لکھنے والی ایک خاتون ادیبہ ہوتا تو اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کرتا۔ ”افشاں اس صبح جب بیدار ہوئی تو جانے کیوں اداس ہو گئی۔ پھر اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اور اداس ہو گئی۔ وہاں سے وہ پائیں باغ میں آئی تو مزید اداس ہو گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ رت بدل رہی ہے اور یہ اداسی کے نیلے پیلے اور ہرے رنگ کے جو بادل اس کے جامنی لباس اور گلابی دوپٹے سے لپٹ لپٹ کر رو رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ موسم بدل گیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ جیسے سرد آہوں کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے...... ناآسودہ تمناؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ افشاں اگر اس لمحے برساتی پہنے ہوئے نہ ہوتی تو یقیناً اس بارش میں بھیگ جاتی اور اس کا حسن مزید نکھر جاتا۔ یاد رہے کہ جامنی لباس اور گلابی دوپٹا اس برساتی کے نیچے ہے۔ پھر اس نے آسمان کی جانب دیکھا تو وہاں سمندری بگلوں‘ ابابیلوں‘ راج ہنسوں‘ مرغابیوں‘ کوؤں اور گدھوں کی قطاریں اڑان کر رہی تھیں اور انہیں دیکھ کر وہ دوسری بار جانے کیوں اداس ہو گئی...... یہ پرندے آگئے تھے اور ”وہ“ نہیں آیا تھا۔ پائیں باغ میں بلبلیں بول رہی تھیں اور اسے وہ گیت یاد آگیا کہ پنچھی جارے۔ جارے میرا بلبل سو رہا ہے‘ شور و غل نہ مچا...... یقیناً ان میں ایک بلبل ایسا تھا جو ابھی تک سو رہا تھا اور باقی بلبلیں بول رہی تھیں۔ تیز اور سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور افشاں کی ناک میں کھجلی سی ہوئی اور اس نے سردیوں کی آمد کا استقبال ایک چھینک سے کیا۔ یہ اس کی یاد تھی جواب چھینکوں میں بدل چکی تھی۔ متعدد چھینکوں کے بعد افشاں کو نمونیا ہو گیا اور بخار کی حدت سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرخ ہو کر شدید پیار

بھری ہو گئیں۔ اس نے سوچا‘ کتنا اچھا ہو اگر میں مر جاؤں اور پھر اس پائیں باغ میں دفن کر دی جاؤں۔ پھر میرا بلبل آئے اور میری قبر پر چہچہانے لگے۔ اللہ نے افشاں کی آرزو پوری کر دی اور وہ ایک دلدوز چیخ مار کر فوارے کے اوپر گری اور فوت ہو گئی۔ اسی وقت کہیں سے ایک بلبل آیا اور گانے لگا۔ او جانے والے رے‘ ٹھہرو ذرا رک جاؤ‘ لوٹ آؤ...... لیکن جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں۔ موسم بدلنے پر اداس ہوتے ہیں اور یہ دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔

اب آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں کہ رت کیسے بدلتی ہے اور رومان پرور لوگوں پر کیسے اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ رومانوی تمہید میں نے صرف اسی لیے باندھی ہے تاکہ میں حسب وعدہ اس بدلتے ہوئے موسم کے حوالے سے چند انتہائی لذیذ کھانے بنانے کے طریقے آپ کی خدمت میں پیش کروں...... کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ کھانے کا مزہ سردیوں میں ہوتا ہے تو ملاحظہ کیجئے چند نہایت نادر اور ذائقہ دار تراکیب......

دھواں گوشت بنانا...... جن زمانوں میں گیس اور مٹی کے تیل کے چولہوں کا رواج نہیں ہوا تھا اور کھانا اپلوں اور لکڑیوں کی آگ پر پکایا جاتا تھا تب ہر گھر میں روزانہ دھواں گوشت پکتا تھا...... پکایا کچھ اور جاتا تھا لیکن گیلی لکڑیوں کے سلگنے سے وہ دھواں گوشت بن جاتا تھا اور مجازی خدا اکثر اوقات یہ دھواں لگی ہانڈی بیوی کے سر پر توڑ دیتا تھا کہ یہ کھانا پکایا ہے آج پھر اسے دھواں لگ گیا ہے۔ چنانچہ روزانہ ایک ہانڈی کے نقصان سے میاں بیوی کے تعلقات انتہائی خوشگوار رہتے تھے۔ لیکن اب خاوندوں کو اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں۔ اگر خاوند کو کھانا پسند نہ آئے تو بیوی پریشر ککر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی ہے۔ ہانڈی کا فائدہ ہی یہ تھا کہ پہلے وار پر ٹوٹ جاتی تھی جبکہ پریشر ککر میں یہ آسانی نہیں ہوتی۔ اسے بار بار استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ گیس اور مٹی کے چولہوں کی آمد سے خوراک میں دھوئیں کی آمیزش ناممکن ہو گئی اور لوگ دھواں گوشت کو ترسنے لگے۔ اب پہلے گوشت کو اچھی طرح بھونا جاتا ہے۔ پھر اس میں سلگتے ہوئے کوئلے رکھ کر انہیں زور سے پھونک ماری جاتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے اور یوں اچھے بھلے گوشت کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ میر تقی میر بھی دھواں گوشت کے شوقین تھے۔ اس لیے جہاں کہیں بھی دھواں اٹھتے دیکھتے تھے‘ اپنی پلیٹ لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے کہ یہاں دھواں گوشت کھانے کو ملے گا۔

روسٹ بکرا...... یہ اگرچہ خواص کی ڈش ہے لیکن اگر پانچ چھ سو عوام مل کر ایک بکرا خرید لیں تو وہ بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ آپ نے وہ بکرا نہیں خریدنا جسے ہر حکومت کہتی ہے کہ قربانی دو...... بلکہ وہ بکرا خریدنا ہے جسے سی ٹی بی ٹی‘ فارن کرنسی

اکاؤنٹ، بجلی کے بل اور کالا باغ ڈیم کی وجہ سے کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ پاکستان میں تو ایسا بکرا مشکل سے ملے گا' اس لیے در آمد کرنا ہوگا۔ روسٹ بکرے کے لیے یہ از حد ضروری ہے کہ آپ کے پاس ایک عدد بکرا ہو۔ اگر بکرا نہیں ہوگا تو کسے روسٹ کریں گے۔ لوگ مذاق اڑائیں گے کہ دیکھو یہ شخص بکرا روسٹ کر رہا ہے اور اس کے پاس بکرا ہی نہیں ہے...... بکرے کے علاوہ کوئی اور جانور کار آمد نہیں ہوگا۔ اگر آپ بکرے کی بجائے شتر مرغ لے آئیں گے تو وہ روسٹ شتر مرغ ہوگا' روسٹ بکرا نہیں ہوگا۔ یہ کامن سینس کی بات ہے۔ یہ ڈش بنانے کے لیے ایک عدد بکرے کے علاوہ آگ بھی درکار ہے...... آگ کے بغیر بکرا روسٹ کرنے کی کوشش ہمیشہ ناکام ہو جاتی ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ترکیب نہایت آسان ہے۔ بکرے کو آگ میں ڈال دیں اور جب اس کا رنگ سیاہ ہو جائے تو نکال لیں۔ لیجئے ذائقے دار بکرا روسٹ تیار ہے۔ البتہ ایک احتیاط لازم ہے۔ بکرے کو آگ میں ڈال کر خود پیچھے ہٹ جائیں ورنہ بکرا روسٹ کے ساتھ ساتھ بندہ روسٹ بھی تیار ہو جائے گا۔

پیزا تیار کرنا...... یہ بنیادی طور پر ایک اطالوی خوراک ہے جسے امریکیوں نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ چونکہ جو کچھ امریکی کرتے ہیں' وہی کچھ ہم کرتے ہیں' اس لیے ہم بھی پیزے کے شوقین ہو گئے ہیں۔ بہترین پیزا تیار کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ موچی دروازے جا کر درجن بھر قیمے والے نان خریدیں۔ قیمہ زیادہ دن کے مرے ہوئے جانور کا نہیں ہونا چاہیے ورنہ ذائقے میں فرق آ جائے گا۔ آپ اکثر لاہور کی سڑکوں پر ایسے ریڑھے دیکھتے ہیں جن پر مردہ بیل اور بھینسیں لدے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ کھال کے ساتھ ہوتے ہیں' کبھی کھال کے بغیر۔ یوں سمجھ لیجئے' یہ آپ کے قیمے والے نان ہیں اور خوش ذائقہ کباب ہیں۔ تو درجن بھر قیمے والے نان خرید کر لائیں۔ ان پر ٹماٹر کے قتلے سجائیں۔ تھوڑا سا پنیر ڈالیں اور دوستوں کی خدمت میں پیش کر دیں اور یہ کہہ کر پیش کریں کہ "لیجئے پیزا اور موچی دروازہ قیمونانو" حاضر ہے۔ خواتین و حضرات یہ حقیقت ہے کہ پیزا دراصل قیمے والے نان کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ قیمے والا نان چونکہ آٹھ روپے میں ملتا ہے' اس لیے اس میں پیزے کا مزا نہیں آتا۔ وہی نان کسی "پیزا ہٹ" میں دو سو روپے میں کھائیں گے تو لطف آ جائے گا۔

ٹکاٹن تیار کرنا...... یہ خالص لاہوری ایجاد ہے۔ اسے کھایا بھی جا سکتا ہے اور سنا بھی جا سکتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ پسینے میں شرابور ایک صاحب ایک بڑے سارے تھال کے کنارے بیٹھے اسے مختلف ہتھیار نما اشیاء سے زدو کوب کر رہے ہیں اور ٹکاٹن ٹکاٹن

کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جسے زدو کوب کر رہے ہیں' وہ ایک ملغوبہ سا ہے جس میں گردے اور کچھ سفید گول سی چیزیں اچھل کود کر رہی ہیں۔ پہلے پہل تو تھال کو زور زور سے اس لیے کوٹا جاتا ہے تاکہ گاہکوں کو متوجہ کیا جا سکے۔ پھر شنید ہے کہ ایک ناکام موسیقار نے یہ کاروبار شروع کیا تو انہوں نے اسے ایک خاص ردھم سے آشنا کیا اور خوراک سریلی ہو گئی۔ پہلے تو یہ راگ درباری وغیرہ میں ٹکاٹن ٹن کی جاتا تھا لیکن اب پاپ کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اسے دھک دنادن کی ردھم میں بجایا جاتا ہے۔ ٹکاٹن میں تھال میں کوٹی جانے والی خوراک نہیں' اس کی ردھم زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس خوراک میں آپ گلے سڑے ٹماٹر' خراب انڈے' بیمار گردے' آنتیں اور بھینسوں کی چربی آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں اور کسی کو شائبہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔

نہاری اور سری پائے...... یہ خوراک ہر جگہ دستیاب ہے۔ اس لیے اسے پکانے کا تردد نہ کیجئے۔ نہاری اور سری پائے کھانے سے دماغ بلاک ہو جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سے عاری ہو جاتا ہے۔ آنکھوں پر چربی کی تہہ جم جاتی ہے۔ اس لیے یہ خوراک لیڈران کرام کے لیے از حد مفید ہے۔

برین مصالحہ...... اگرچہ یہ ایک پسندیدہ ڈش ہے لیکن بد قسمتی سے ان دنوں برین یعنی دماغ کا حصول بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں محقق حضرات نے دن رات ایک کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے اراکین اور دیگر سرکاری اداروں کے اہلکاروں سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا اور خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ہو سکے۔ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی ہوا ہے کہ جوں جوں آپ اسلام آباد کے قریب جاتے ہیں' اس کا حصول ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے نہ ہونے کا البتہ یہ فائدہ ہے کہ انسان بہت تیزی سے ترقی کرتا ہے اور بڑے بڑے عہدوں تک بآسانی پہنچ جاتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال کو ہی "برین ڈرین" کہا جاتا ہے۔



”میں نے مانسہرہ کیوں چھوڑا تھا؟“

ان پرانی فلموں میں جن میں ہیروئن ہمیشہ ایک شرعی لباس زیب تن کیے درخت کی ایک شاخ تھامے پورے کا پورا سیڈ سانگ یعنی المیہ گانا گا دیتی تھی' ان میں ہمیشہ ایک سچویشن ضرور ہوتی تھی یعنی ہیرو صاحب کا حادثہ ہونا اور اس کے نتیجے میں ہیرو کا سر پر پٹی باندھ کر یادداشت کھو دینا۔ یہ سچویشن ہیروئن کے لیے انتہائی المناک ہوتی تھی کیونکہ اس نے درجن بھر ”تو چھٹی لے کر آجا بالما“ اور ”تو میرا چاند میں تیری چاندنی“ قسم کے گانے گا کر اسے بمشکل اپنی جانب مائل کیا ہوتا تھا اور موصوف اسے پہچانتے تک نہ تھے اور اسے بلینک لکس دیتے تھے بلکہ کبھی کبھار اسے اپنی خالہ جان سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ ہیروئن مسلسل انہیں رومانوی ٹریک پر واپس لانے کی تگ و دو میں مصروف رہتی تھی اور بالآخر ”بچپن کے دن بھلا نہ دینا“ اور ”رم جھم رم جھم پڑے پھوار تیرا میرا نت کا پیار“ گا گا کر ان کی یادداشت واپس لے آتی تھی اور وہ سر سے بندھی پٹی کھول کر کہتے تھے ”لاڈو یہ تم ہو“ اور پھر لاڈو اور وہ دونوں مل کر ایک ہی سانگ گاتے تھے اور گاتے گاتے افق کے پار چلے جاتے تھے۔

دراصل میرے ساتھ بھی ان دنوں یہی مسئلہ ہے کہ میری یادداشت غتر بود ہو رہی ہے۔ کالم لکھنے بیٹھتا ہوں تو وہ ڈرامہ بن جاتا ہے' ڈرامہ شروع کرتا ہوں تو وہ سفرنامہ ہو جاتا ہے اور سفرنامہ لکھتا ہوں تو وہ ناول ہو جاتا ہے کیونکہ کچھ یاد نہیں رہتا کہ کیا لکھنا تھا اور کیوں لکھنا تھا۔ بچپن سے جن راستوں پر سفر کرتا آیا ہوں' اب وہ راستے بھول جاتے ہیں۔ مال روڈ جانا ہوتا ہے تو بھاٹی گیٹ پہنچ جاتا ہوں۔ چہرے بھولتے جاتے ہیں اور رشتے داروں کے بچوں کے نام تو کجا ان کی تعداد بھی یاد نہیں رہتی۔ چنانچہ پہلے بچے کی مبارکباد دیتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو ماشاءاللہ پانچواں ہے اور اگر پانچویں کی مبارکباد دیتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ

شادی ہی نہیں ہوئی...... دوست کہتے ہیں' سٹھیا گئے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ میں ابھی ساٹھ کا ہوا نہیں' سٹھیا کیسے سکتا ہوں تو وہ کہتے ہیں تم جیسے لوگ کسی بھی عمر میں سٹھیا سکتے ہیں۔ مجھے تشویش اس لیے ہے کہ ایک زمانے میں' میں نہایت شاندار یادداشت کا مالک ہوتا تھا اور درجنوں ٹیلی فون نمبرز زبانی یاد تھے۔ اگرچہ یہ سب کے سب خواتین کے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں مجھے اپنی دو خوبیوں پر بے حد فخر تھا۔ ایک یادداشت اور دوسری خوبی یاد نہیں...... اور میری یادداشت کا یہ حال تھا کہ کسی بھی شخص کو صرف بیس پچیس مرتبہ مل کر اسے اگلی بار فوراً پہچان لیتا تھا اور مزید بیس پچیس ملاقاتوں کے بعد اس کا نام بھی ازبر ہو جاتا تھا...... انہی زمانوں کا قصہ ہے کہ ایک روز انارکلی بازار میں ایک صاحب شاپنگ بیگز سے لدے پھندے چلے جا رہے تھے' مجھے دیکھتے ہی شاپنگ بیگز کو ہوا میں اچھال دیا اور مجھ سے لپٹ گئے۔ ”اوئے یار اتنی مدت کے بعد ملاقات ہو گئی ہے۔ سنا کیا حال چال ہے۔

”اب میں ان صاحب کو جتنے غور سے دیکھ سکتا تھا' دیکھتا رہا اور مجال ہے پہچان کا کوئی شائبہ بھی گزرا ہو۔ چنانچہ میں نے ان کا دل رکھنے کی خاطر انہیں دبوچ کر اپنی محبت کا اظہار کیا اور پھر وہ تکنیک برتی جس کے استعمال سے میں فوراً ایسے صاحبان سے اگلوا لیتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کب اور کہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ”یار ان دنوں رہائش کہاں پر ہے؟“

انہوں نے ایک زوردار اگرچہ محبت بھرا جھانپڑ میری کمر پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”یار اسی گھر میں جس میں تم آیا کرتے تھے۔“

اب میں ایک اور کوشش کرتا ہوں ”اور ان دنوں کرتے کیا ہو؟“

وہ ایک اور جھانپڑ رسید کر کے کہتے ہیں۔ ”کرنا کیا ہے...... وہی کچھ جو پہلے کرتا تھا۔“

”اچھا اچھا۔“ میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس کر کہتا ہوں اور ”ٹیلی فون نمبر؟“

”وہ بھی نہیں بدلا......“

اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف مجھے بلکہ میرے خاندان کو جانتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے السیشن کتے کے نام تک سے واقف تھے۔ بہرحال وہ جلدی میں تھے' ایک اور جھانپڑ رسید کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد ہر سال چھ مہینے بعد کسی نہ کسی مقام پر ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ کبھی کسی شادی پر...... کبھی راہ چلتے اور وہ اسی گرم جوشی سے ملتے...... آخری بار لاہور ایئرپورٹ پر ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ”قبلہ والد صاحب اور تایا جان تمہیں یاد کر رہے تھے تو کسی وقت آجاؤ بزرگوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا...... میں ان سے کیا کہتا کہ بزرگوں کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا لیکن میرے پاس تمہارا پتہ نہیں ہے۔ اگر کچھ پتہ ہو تو

وہاں پہنچوں۔ ظاہر ہے یہ دس بارہ برسوں میں ہماری کوئی بیسویں ملاقات تھی اور اگر اب میں ان سے یہ کہہ دیتا کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا اور تمہارا نام کیا ہے تو وہ مجھے براہ راست قتل کر دینے میں حق بجانب ٹھہرتے۔ چنانچہ یہ تھی میری شاندار یادداشت ان زمانوں میں اور اب وہ بھی کھو چکا ہوں۔

اگرچہ اپنے آپ کو تسلی بھی دیتا ہوں کہ یادداشت کا مختصر ہو جانا سراسر عظمت کی نشانی ہے...... سائنس دان آئن سٹائن ٹرام پر سوار ہوتا تھا تو ٹکٹ خریدنے پر کنڈیکٹر جو ریزگاری اسے لوٹاتا تھا' وہ کبھی حساب نہیں لگا سکتا تھا کہ ٹکٹ کتنے کا ہے اور جو ریزگاری واپس ملی ہے' وہ کتنی ہے اور درست بھی ہے یا نہیں حالانکہ خود اس صدی کا سب سے بڑا حساب داں تھا۔

میرے عزیز دوست اور ممتاز اداکار منور سعید کا کہنا ہے کہ جب وہ اپنے چچا سید محمد تقی کے ہاں بارات لے کر گئے تو سید صاحب کسی فلسفے کی گتھی میں الجھے ہوئے تھے۔ منور سعید کو ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پھر سے الجھ گئے۔ خاصی دیر کے بعد خیال آیا کہ بھتیجا آیا ہوا ہے تو اس سے پوچھتے ہیں کہ کیوں میاں برخوردار کس سلسلے میں تشریف لائے ہو؟ اب منور سعید اپنے منہ سے کیوں کہتے کہ قبلہ چچا جان میں تو فی الحال دولہے کے گٹ اپ میں ہوں اور آپ کی عزیز از جان بیٹی کو بیاہنے آیا ہوں۔ چنانچہ دوستوں نے تقی صاحب کو یہ اطلاع اگرچہ ڈرتے ڈرتے گوش گزار کر دی۔

یادداشت کھو جانے سے مجھے یوں بھی اطمینان سا ہے کہ چلو اچھا ہوا تم بھول گئے کیونکہ ہمارا قومی کردار بھی یہی ہے کہ ہماری یادداشت کھو چکی ہے۔ کسی کو کچھ یاد نہیں کہ پاکستان کیوں بنا تھا؟ کس لیے بنا تھا؟ جو نصف ملک کھو دیا' وہ بھی یادداشت سے اور نصابوں سے محو ہو چکا ہے۔ کسی کو مارشل لاء یاد نہیں۔ کو آپریٹو اسکینڈل اور تاج کمپنی اسکینڈل یاد نہیں۔ قرض اتارو ملک سنوارو کا کیا ہوا' کچھ یاد نہیں۔ لیڈران کرام جو وعدے کرتے ہیں' وہ یاد نہیں رکھتے اور عوام لیڈران کرام جو ان کے ساتھ کر چکے ہیں' وہ یاد نہیں رکھتے۔ چنانچہ دوبارہ اعتبار کرتے ہیں اور انہیں دوبارہ ووٹ دے دیتے ہیں۔ ہم نے یاد ماضی کا بکھیڑا ہی نہیں پالا ہوا' اس لیے کہ حافظہ چھن چکا ہے۔ ہم ایسے مومن ہیں جو بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں۔ کبھی پاکستان کو ایک ویلفیئر سٹیٹ بنانے کی نوید دی جاتی ہے اور کبھی اسے ایشین ٹائیگر بنا دینے کی خوشخبری دی جاتی ہے اور دور دور تک ٹائیگر کی دم بھی نظر نہیں آتی۔ عوام کو قربانی دینے اور کفایت شعاری کا مشورہ دیا جاتا ہے لیکن پرائم منسٹر ہاؤس پر ایک ارب سے زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ کوئی بھی پرائم منسٹر آئے' وہ اس پرائم

منسٹر ہاؤس میں کوئی کفایت نہیں کرتا یا کرتی کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہاں تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔ جیسے محترمہ نے فرمایا تھا' میرے بچے پرائم منسٹر ہاؤس سے نکلنے پر بے حد اپ سیٹ ہوتے ہیں۔ ایک اور محترمہ نے فرمایا تھا کہ ملک میں ابھی تک گندم کی کمی کی وجہ سے کوئی مرا نہیں تو اتنا واویلا کیوں مچایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری اجتماعی یادداشت سے گم ہو چکا ہے۔ ہم وہ بہرے ہیں جو کوئی آواز نہیں سنتے اور مسکراتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے بھی زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی اس قوم کا ایک معزز فرد بن چکا ہوں۔ نہ صرف یہ کہ میری یادداشت ناتواں ہو گئی ہے بلکہ مجھ سے جو لوگ ملتے ہیں' وہ مجھ سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ پچھلے دنوں میں ایک ڈاکٹر کے کلینک میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور بار بار بٹوہ نکال کر نوٹوں کو باہر نکالے بغیر حساب لگا رہا تھا کہ فیس کے پیسے کم نہ ہو جائیں۔ میرے سامنے ایک خان صاحب تشریف رکھتے تھے' مجھے دیکھ کر وہ اٹھے اور نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے کیسے ہو بھئی؟ میں نے کہا' اللہ کا شکر ہے' آپ سنائیں۔ کہنے لگے' بھئی تم تو بڑے بے وفا نکلے۔ میں نے عرض کیا کہ جی اس عمر میں ہم نے کیا بے وفائی کرنی ہے اور پھر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی واپس جا کر کوئی اخبار وغیرہ دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہیں بیٹھے بیٹھے بلند آواز میں بولے "لیکن تم نے مانسہرہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"مانسہرہ؟" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں...... تم نے مانسہرہ چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اتنی خوبصورت جگہ تھی۔ تمہارا گھر بھی آرام دہ تھا۔ بچے تو شاید دوسری بیوی میں سے تھے۔ اسی لیے ابھی کنڈر گارٹن میں پڑھتے تھے۔"

اب ظاہر ہے میں گلگت یا سکردو جاتے ہوئے متعدد بار مانسہرہ سے گزرا تھا اور اس سرسبز اور شاداب وادی کو بے حد پسند کرتا تھا لیکن آج تک وہاں رہائش اختیار کرنے اور دوسری بیوی کے بچوں کو کنڈر گارٹن میں پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں کیا جواب دیتا' بس مسکراتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری طرح یادداشت کے معاملے میں غتربود ہو چکے ہیں اور مجھے پتہ نہیں کون اور کیا سمجھ رہے ہیں اور قدرے ناراض بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کہنے لگے' مسکرائے چلے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں بتاتے کہ مانسہرہ کیوں چھوڑا تھا؟

"بس خان صاحب حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔" میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"دوسری بیوی کا کوئی مسئلہ ہو گا۔ وہ بھی تو مانسہرے میں تھی ناں؟"

میں مانسہرے کے تذکرے سے اتنا تنگ آچکا تھا کہ اگر آس پاس کوئی اینٹ وغیرہ دستیاب ہوتی تو اسے اٹھا کر بے دریغ خان صاحب کو دے مارتا۔ البتہ کلینک میں اپنی باری کا انتظار کرنے والے دیگر مریض اس صورتحال سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے خان صاحب کو میرے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ "لو میں اسے نہیں جانتا۔ مانسہرے میں رہا کرتا تھا۔" ان کی باری مجھ سے پہلے آگئی۔ وہ اندر گئے' چیک اپ وغیرہ کروا کے باہر نکلے تو کلینک سے نکلتے ہوئے مڑ کر کہنے لگے "نہیں بتایا ناکہ مانسہرہ کیوں چھوڑا تھا؟"..

کئی بار مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ درست کہہ رہے تھے۔ نہایت معقول قسم کے شخص تھے' ہرگز حواس باختہ وغیرہ نہیں تھے اور اتنے اعتماد سے بات کر رہے تھے تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یادداشت غتربود ہونے کی بنا پر مجھے یاد ہی نہیں کہ میں کبھی مانسہرہ میں رہا کرتا تھا اور میری دوسری بیوی بھی تھی جس کے بچے کنڈر گارٹن میں پڑھتے تھے۔ اب پتہ نہیں ان بچوں کے نام کیا کیا تھے' کچھ یاد نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ میں نے مانسہرہ کیوں چھوڑا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نے مانسہرہ کیوں چھوڑا؟

☆☆☆

"رشتہ حاصل کرنے کا صحیح طریقہ......!"

میں نے اپنے ایک گزشتہ کالم میں شادی کے خواہشمند نوجوانوں کو خبردار کیا تھا' وہ اگر اپنی ماسی کرم بی بی کو سرخ گرگابی اور ہرے سوٹ میں رشتہ لینے کے لیے روانہ کریں گے تو ادھر سے ہر صورت انکار ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں بعض متاثرین نے مجھ سے رابطہ کیا ہے اور درخواست کی ہے کہ رشتہ حاصل کرنے کا صحیح طریقہ اگر بیان کر دیا جائے تو اس سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔ پچھلے زمانوں میں ذات برادری اور قبیلے کے بندھن بہت مضبوط تھے اور آپس میں ہی لین دین ہو جاتا تھا۔ خاندان میں جتنے لڑکے لڑکیاں ہوتے تھے' انہیں گھر سے باہر نہیں جانے دیا جاتا تھا یعنی ایک دوسرے سے نتھی کر کے ٹانکا لگا دیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر میری والدہ ہمیشہ پوچھتی تھیں کہ یہ لوگ ہیں کون؟ ذات کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اب پوچھا جاتا ہے' ان کے پورچ میں گاڑی کون سے ماڈل کی تھی؟ کبھی کرپشن میں اندر بھی ہوئے ہیں یا خواہ مخواہ شرفاء میں شمار ہو رہے ہیں؟ چنانچہ رشتہ حاصل کرنے کی تازہ ترین تکنیک کا جاننا از حد ضروری ہے ورنہ آپ کنوارے ہی فوت ہو جائیں گے اور جنازے کے جائز ہونے کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ چونکہ ہم سب ماشاءاللہ مسلمان ہیں' اس لیے ذات برادری کا جھگڑا تو ختم ہو چکا' سوائے نیشنل اسمبلی کے' اس لیے ہم پیشوں کو مدنظر رکھ کر یہ رشتہ گائیڈ ترتیب دے رہے ہیں...... تو ملاحظہ فرمائیے رشتہ حاصل کرنے کا صحیح طریقہ......

رشتہ برائے سیاستدان...... بہتر تو یہی ہے کہ ایسے بچے کی شادی کے لیے کسی سیاسی خاندان سے ہی رجوع کیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی صنعت کار کے گھر بھی ڈاکہ ڈالا جا سکتا ہے۔ معاف کیجئے گا رشتے کے لیے کسی صنعتکار کے گھر بھی جایا جا سکتا ہے...... کیونکہ بقول کسے سیاست اور صنعت اصل میں دونوں ایک ہیں بلکہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عام طور پر

دیکھا گیا ہے کہ سیاستدان جونہی اقتدار میں آتے ہیں تو دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتے کرتے ملک کے اہم صنعتکار بن جاتے ہیں۔ دن میں صرف دوگنی ترقی اس لیے ہوتی ہے کہ سب دیکھ رہے ہوتے ہیں جب کہ رات میں چوگنی کی بجائے چار سو گنا ترقی ہو جاتی ہے جسے محاورے کی مجبوری کے باعث صرف چوگنی کہا جاتا ہے...... رات کو اتنی ترقی کرنے میں ایسے عوامل شامل ہیں جن کا تذکرہ شرعی طور پر درست نہیں ہوگا...... اسی طرح دیکھتے دیکھتے صنعتکار نہایت جہاں دیدہ اور پُر فخر سیاستدانوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہاں مثالیں دینا خطرے سے خالی نہیں' آپ خود سیانے بیانے ہیں۔ چنانچہ سیاستدان بچے کا رشتہ حاصل کرنے کے لیے جائیں تو لڑکی والوں سے صرف یہ دریافت کریں کہ ان کے سوئس اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟ انہوں نے بینکوں کا کتنا قرضہ دینا ہے اور آج تک کتنی بجلی چوری کر چکے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں اگر چاچا جی پیپلز پارٹی میں ہیں تو بھتیجا صاحب مسلم لیگ کے پرچم تلے شیر شاہ سوری کے گن گاتے ہیں جب کہ والد صاحب قبلہ جماعت اسلامی کے جلسوں کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں۔ کچھ لوگ بھتہ بھی جمع کرتے ہیں لیکن اسے صرف نیک کاموں کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں انکار نہ کیجیے کیونکہ کفن دفن کے لیے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ ہو جائے گی۔ چنانچہ سیاسی خاندان والوں سے یہ مت پوچھیے کہ ان کا تعلق کس پارٹی سے ہے...... فی الحال وہ اُسی پارٹی میں ہوں گے اور شادی تک وہ اسی پارٹی میں ہوں گے۔

رشتہ برائے شاعر...... شاعر بچے کے لیے رشتہ تلاش کرنا بہت آسان ہے۔ کسی بھی تازہ ترین جنتری کے اوراق کا مطالعہ کیجیے اور اس میں جو منحوس ترین دن درج کیا گیا ہے' اس روز کسی بھی گھر چلے جائیے' انشاء اللہ یہ لڑکی کے لیے بھی منحوس ترین دن ثابت ہوگا۔ لڑکی والوں سے ہرگز یہ تذکرہ نہ کیجیے گا کہ لڑکا شاعر ہے بلکہ انہیں بتائیے کہ وہ قوم کی فکری رہنمائی کر رہا ہے۔ وہ سمجھیں گے شاید لڑکا سیاستدان ہے اور فوراً رشتہ قبول کر لیں گے۔ چنانچہ اسی لمحے ان کی سیاہ بختی کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر بدقسمتی سے دوسری پارٹی کو مخبری ہو جائے کہ لڑکا شاعر ہے تو انہیں فوراً بتائیے کہ شاعر تو ہے لیکن مزاحیہ شاعر ہے کیونکہ ان دنوں تھیٹر کے بہترین کامیڈین بھی اتنا مال نہیں کماتے جتنا مزاحیہ شاعر کماتے ہیں۔ مزاحیہ شاعر ہونے کے لیے مزاحیہ شکل شرط اولین ہے۔ ایک ایسے ہی سنجیدہ شکل کے شاعر جب اپنی مزاحیہ شاعری سنا رہے تھے تو ایک صاحب نے اٹھ کر فرمائش کی کہ قبلہ اب آپ اپنی مزاحیہ شاعری سنائیے۔

رشتہ برائے مولوی صاحب...... اس کیٹگری کے لڑکوں کو رشتے کم کم ملتے ہیں۔
اس کی کچھ وجوہ نامعلوم ہیں۔ جیسے مذہبی جماعتوں کو کم ووٹ ملنے کی بھی کچھ وجوہ نامعلوم ہیں۔

اس میں شاید مدرسے کی تعلیم کا بھی کچھ عمل دخل ہے کیونکہ وہاں صرف لڑکوں کی مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔ ہمیں ایک جماعت کے ورکر نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں خواتین مرد ممبروں کو بھائی کہتی ہیں اور مرد حضرات خواتین کو بہن کہہ کر بلاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نوجوان لیڈر سے جب انہوں نے پوچھا کہ بھائی آپ کی شادی کب ہو رہی ہے تو وہ کہنے لگے 'ایک بہن کے ہاں والدہ کو بھیج رکھا ہے' شاید رشتہ ہو جائے تو آپ بھی یہی نسخہ آزمائیے۔

رشتہ برائے اداکار...... کم از کم رشتہ حاصل کرنے کے معاملے میں مولوی اور اداکار ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اداکار کو بھی رشتہ دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کے والدین بھی جب راقم الحروف کے لیے رشتہ مانگنے گئے تھے تو لڑکی والوں کو اس معاملے میں مکمل اندھیرے میں رکھا تھا کہ لڑکا ٹیلی ویژن پر ایکٹنگ کرتا ہے۔ نکاح کے بعد جب کسی حاسد نے سسرال کو خبر کر دی تو ہر طرف ہاہاکار مچ گئی اور ساس صاحبہ نے ہائے ہائے کرتے ہوئے بین کیے کہ میری بیٹی کی تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔ حیرت ہے کہ ساس صاحبہ کو مستقبل کا علم کیسے ہو گیا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اداکار بیٹے کے پیشے کو مخفی رکھا جائے اور جونہی لڑکی والے "ہاں" کریں' فوری طور پر نکاح کر کے رخصتی حاصل کر لی جائے۔ اس میں لڑکے کا بھلا ہوگا اور لڑکی کا بُرا ہوگا......

رشتہ برائے گلوکار...... گلوکار بچے کو کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ لڑکا گانے والا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ آرٹسٹ ہے۔ اس طرح لڑکی والے اس غلط فہمی میں مارے جائیں گے کہ وہ کوئی مصور ہے۔ ایک مرتبہ مارے جائیں تو پھر ان کے جی اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گلوکار ابرار اگرچہ تعلیم یافتہ ہے جاٹ ہے اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اسے بھی ان دنوں یہی دشواری پیش آ رہی ہے کہ اسے بلو کے "گھرانے" سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے احتیاط لازم ہے۔ البتہ لڑکی والوں کا تعلق بھی اگر کسی صبح بیاسی گھرانے سے ہو تو وہ بخوشی مان جائیں گے لیکن ہاں کرنے سے پیشتر چیک کریں گے کہ لڑکا سُر میں ہے یا نہیں۔ یہ چیک کم از کم میڈیکل چیک اپ سے بہتر ہے جس میں لڑکا اَن فٹ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

رشتہ برائے سی ایس پی...... آپ کو تردّد کرنے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ یہ واحد کیٹگری ہے جس میں لڑکی والے بہ نفسِ نفیس حاضر ہو کر رشتہ پیش کرتے ہیں بلکہ پوری زندگی کے اخراجات بھی پیش کرتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے جو بالکل غلط ہے' صرف خرید ہوتی ہے۔ اس کیٹگری میں سہولت بھی ہے کہ لڑکے کی شکل صورت بالکل نہیں دیکھی جاتی اور سیرت تو بالکل ہی

نہیں دیکھی جاتی۔ چنانچہ شکل صورت سے پیدل نوجوان اگر اعلیٰ خاندان کی خوبصورت اور تعلیم یافتہ دوشیزہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو فوراً سی ایس پی ہو جائیں...... اگر نہ ہو سکیں تو بھی مضائقہ نہیں کیونکہ شادی تو یوں بھی نہیں ہونی تھی۔

رشتہ برائے فوجی...... ایک زمانے میں فوجی جوانوں کے رشتوں میں بڑی آسانی تھی۔ ان دنوں کہا جاتا تھا کہ کاکول اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے والا ہر سیکنڈ لیفٹیننٹ پاکستان کی صدارت کی قطار میں کھڑا ہو جاتا تھا لیکن وہ مارشل لاء کے زمانے تھے، جمہوریت کی وجہ سے صورتحال بدل چکی ہے۔ چونکہ فوج میں اوپر کی آمدنی کے مواقع نہیں ہوتے، اس لیے لاڈلی اور بینکوں کے قرضوں سے پلی ہوئی لڑکیوں کے والدین فوجی دامادوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ فوجی جوان کے لیے رشتہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسری پارٹی کو صرف اس کی یونیفارم والی تصویر دکھائی جائے۔ لڑکا دکھانے سے گریز کیا جائے۔ اگر دکھانا ضروری ہو تو وہ تازہ حجامت شدہ نہیں ہونا چاہیے۔ فوجیوں کی بیویوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر خاوند کپتان ہو تو ان کا رینک جنرل کا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ریٹائر ہو جائے تو بیوی کے پاس صرف جنرل نالج رہ جاتی ہے۔ البتہ ان دنوں فوج سول محکموں مثلاً واپڈا وغیرہ میں بھی آ رہی ہے، اس لیے معاشی صورتحال بہتر ہونے کا امکان ہے یعنی فوجیوں کی معاشی صورتحال......

رشتہ برائے پاگل...... یہ بہت آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ آپ ایک تلاش کریں تو ہزار ملتے ہیں۔ ظاہر ہے آپ لڑکی والوں کو یہ نہیں بتائیں گے کہ لڑکا ماشاءاللہ سے پاگل ہے بلکہ انہیں اپنی جائیداد کی تفصیل بتائیں گے اور کہیں گے کہ لڑکا دانشور ہے، ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لڑکیاں بھی پاگلوں کو پسند کرتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ وہ رومینٹک ہو رہے ہیں۔ یوں بھی جو شخص بہ قائمی ہوش و حواس شادی کرنا چاہتا ہے، وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے۔ چنانچہ نارمل شخص کے شادی کے بعد پاگل ہونے کے قوی امکانات ہیں جب کہ پاگل شخص مزید کیا پاگل ہو گا بلکہ اپنی پارٹی کے برسر اقتدار آنے پر وہ کسی بھی اعلیٰ عہدے پر فائز کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا سر مسلسل اثبات میں ہلتا رہتا ہے۔

رشتہ برائے غریب...... آج تک کسی غریب کا رشتہ نہیں ہوا۔ اس لیے غریبوں کو شادی کی کوشش ترک کر دینی چاہیے۔ یوں بھی شادی کر کے مزید غریب پیدا کرنے سے فائدہ......؟ خواہ مخواہ ملک کی اقتصادی حالت مزید ابتر ہو جائیگی اور ہم ایشین ٹائیگر نہیں بن سکیں گے۔

☆☆☆

”ایک کراچی کِڈ سے ملاقات“

وہ اگرچہ ایک کراچی کڈ تھا لیکن ایک لاہور کڈ یا اسلام آباد کڈ بھی ہو سکتا ہے۔

وہ مجھے ایئرپورٹ لاؤنج میں جب کہ میں ایک تاخیر شدہ پرواز کے انتظار میں مسلسل جمائیاں لے رہا تھا، ملا۔ اس نے اپنی ممی سے الگ ہو کر میرے نزدیک آ کر نہایت اعتماد سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔ ”انکل آپ ٹی وی پر آتے ہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے؟“

میں نے سر ہلایا اور پوچھا ”لیکن اے پیارے بچے آپ کون ہیں؟“

”میرا نام تو عطاءاللہ ہے لیکن سب لوگ مجھے ہائے کڈ کہتے ہیں۔“

میں نے انتظار کی کوفت کم کرنے کے لیے اس ہائے کڈ کے ساتھ گپ لگانی شروع کر دی۔ چونکہ وہ کراچی سے آیا تھا، اس لیے میں نے اسے کراچی کڈ کہنا مناسب سمجھا۔

”تو اے پیارے کڈ، آپ مجھے ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں، اس لیے آپ نے مجھے پہچان لیا؟“

”نہیں۔ میں نے تو آپ کو کبھی ٹیلی ویژن پر نہیں دیکھا لیکن میری ممی نے مجھے بتایا کہ یہ انکل ٹیلی ویژن پر آتے ہیں، تم انہیں جا کر ہائے انکل کہو۔“

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو ایک سڑیل سی ماڈرن ممی تھیں اور نہایت رغبت سے پوٹیٹو چپس پھانک رہی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھا تو انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا کہ میری طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ بچہ جو بھیج دیا ہے، یہ کافی نہیں ہے۔ غالباً وہ اس بچے کی مسلسل گفتگو سے بیزار ہو چکی تھیں اور انہوں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میری جانب روانہ کر دیا تھا۔

"توہائے کڈ' آپ ٹیلی ویژن بالکل نہیں دیکھتے۔ آپ کیسے کڈ ہو؟"

"میں ایک سُپر کڈ ہوں اور صرف ڈش کے فارن پروگرام دیکھتا ہوں۔ پاکستانی ٹیلیویژن نہیں دیکھتا۔"

"کیوں نہیں دیکھتے؟"

"پاکستانی ٹیلی ویژن کون دیکھتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ اس پر تو بور بور پروگرام ہوتے ہیں۔ پرائم منسٹر اور منسٹر ہوتے ہیں جو لیس منسٹر ہوتے ہیں۔ کارٹون اور میوزک نہیں ہوتے۔ کامیڈی نہیں ہوتی۔"

"اس کا مطلب ہے تم خبرنامہ نہیں دیکھتے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"خیر...... دیکھو کڈ تم پاکستانی ہو' اس لیے تمہیں پاکستانی پروگرام ضرور دیکھنے چاہئیں۔ اس طرح تمہیں اپنے ملک کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اپنے وطن کے مختلف حصوں کے بارے میں انفرمیشن ملتی ہے۔"

"وہ میں کیا کروں گا؟" کڈ نے حیران ہو کر کہا۔ "میں ایک زبردست انگلش میڈیم سکول میں پڑھتا ہوں جس کا سارا سٹاف صرف انگریزی بولتا ہے۔ اگر ہم انگریزی نہ بولیں تو ہمیں جرمانہ ہوتا ہے۔ ہمارے کچھ ٹیچرز انگریز ہیں اور کچھ امریکن...... آپ کے ساتھ تو میں اُردو اس لیے بول رہا ہوں کہ آپ نے شلوار قمیض پہن رکھی ہے اور آپ کو انگریزی نہیں آتی۔ اردو میں نے اپنے نوکروں سے سیکھی ہے۔ ہمارے نوکر بھی شلوار قمیض پہنتے ہیں۔"

"پیارے کڈ تم اپنے سکول میں پاکستان کے بارے میں کیا سیکھتے ہو؟"

"انکل...... یو آر جوکنگ...... پاکستان وغیرہ کے بارے میں تو شاید دیسی سکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ میری ممی اگر پندرہ ہزار روپے مہینہ اسکول کی فیس دیتی ہیں تو اس لیے تو نہیں دیتیں کہ ہم پاکستان کے بارے میں بور بور باتیں پڑھیں۔"

"تو پھر تم وہاں کیا پڑھتے ہو کڈ؟"

"آپ کو سمجھ نہیں آئے گی...... لیکن ہم وہاں جغرافیہ بھی پڑھتے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کڈ۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تو تم اسکول میں یہ تو پڑھتے ہو کہ پاکستان کے کتنے صوبے ہیں۔ کونسے دریا ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

کڈ یہ بات سن کر بے حد رنجیدہ ہوا۔ "انکل آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ امریکہ میں کتنی سٹیٹس ہیں۔ میں سب کے نام جانتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ دریا کونسے ہیں۔ ان کی لمبائی کیا

ہے۔ مجھے امریکہ کے تمام صدروں کے نام یاد ہیں۔ میں تو بیس بال کے مشہور کھلاڑیوں کے نام بھی جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے کینیڈا اور آسٹریلیا کے بارے میں پوچھیں۔ ہم انگلش لٹریچر بھی پڑھتے ہیں۔ مجھے انگلش پوئٹس کی پیدائش کی تاریخیں بھی یاد ہیں اور ان کی نظمیں بھی۔"

"بچے تم جانتے ہو کہ کالا شاہ کاکو کہاں ہے؟"

بچہ یکدم خوفزدہ ہو گیا۔ "انکل میرے پاس نہیں ہے۔"

"بیٹے ڈرنے کی کوئی بات نہیں' یہ تو ایک پاکستانی قصبے کا نام ہے۔"

"پلیز انکل آپ مجھ سے سٹیٹ آف کیلیفورنیا کے کسی ٹاؤن کا نام پوچھ لیجئے۔ ایسے کاکو قسم کے ہوریبل نام نہ پوچھئے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم سبّی' سرگودھا' خضدار' صوابی ایسے ہوریبل ناموں کو بھی نہیں جانتے؟"

"نووے۔" اس نے کندھے سکیڑ کر کہا۔ "لیکن انکل آپ نے اس قسم کے نام کہاں سے سیکھے ہیں؟ آپ کے زمانے میں کیا پڑھاتے تھے؟"

میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ میں تو نارمل سکول۔ مشن سکول اور مسلم ماڈل سکول وغیرہ میں پڑھا ہوا تھا اور میری ممی نے کبھی بھی ایک روپیہ چار آنے سے زیادہ ماہانہ فیس ادا نہیں کی تھی۔ دس ہزار تو میرا خیال ہے کہ میری تعلیم کا کل خرچہ ہوا تھا اور اس میں تختی' سلیٹ اور کاپیوں وغیرہ کا خرچہ بھی شامل تھا۔ "بھئی کڈ صاحب جب میں نارمل سکول گکھڑ منڈی میں پڑھتا تھا تو اس زمانے کے ماسٹروں کا خیال تھا کہ ہم جن علاقوں میں رہتے ہیں' ہمیں ان کی فصلوں' نہروں' دریاؤں اور دو آبوں کا علم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم فصلوں کے نام یاد کرتے تھے۔ نہروں کے نام رٹا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لاہور سے راولپنڈی تک کے تمام سٹیشنوں کے نام یاد کرتے تھے۔ اب بھی میں ٹرین میں سفر کرتا ہوں تو میں جانتا ہوں کہ گوجرخان کے بعد کونسا اسٹیشن آتا ہے۔"

"لیکن انکل اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا تھا؟ یہ تو ماڈرن ایجوکیشن نہیں ہے' بہت بیک ورڈ ایجوکیشن ہے۔"

"ہاں فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن ہم جس سرزمین پر رہتے تھے' اس کے چپّے چپّے سے واقف تھے اور اس لیے اس سے محبت کرتے تھے کیونکہ واقفیت کے بغیر تو محبت نہیں کی جا سکتی۔"

"نہیں انکل۔ میں نے بھی اپنے کمرے میں "آئی لو پاکستان" کا سٹکر لگا رکھا ہے۔ ابوّ

کی ہونڈا کی ونڈ شیلڈ پر ”رزق حلال عین عبادت ہے“ کا سٹکر لگا ہوا ہے۔ ہم بھی پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن دنیا سکڑ گئی ہے۔ آپ کو شاید نہیں پتا کہ اب اسے گلوبل ولیج کہا جاتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کے بارے میں جاننا چاہیے۔ پاکستان کے بارے میں جاننے کا کیا فائدہ ہے۔ یہاں تو صرف قتل ہوتے ہیں۔ مولوی لوگ لڑتے ہیں......ڈاکے پڑتے ہیں۔“

”لیکن یار کڈ...... قتل تو نیویارک میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈاکے تو وہاں معمول کی بات ہیں۔“

”لیکن انکل وہ تو ایک فری کنٹری ہے۔ میرے دو انکل اور تین آنٹیاں گرین کارڈ ہولڈر ہیں اور میں بھی یہاں سکول ختم کر کے وہاں چلا جاؤں گا۔ ابو کہتے ہیں' پاکستان بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے اور آپ بھی یہ تو مانتے ہیں ناں کہ گندا ملک ہے۔ یہاں مکھیاں بہت ہیں۔ انکل آپ باہر کیوں نہیں سیٹل ہوتے؟“

”یار کڈ...... میں گیا تو تھا باہر لیکن وہاں دل نہیں لگا۔ واپس آ گیا۔“

”یہ تو آپ نے بہت بے وقوفی کی انکل...... آپ کا مطلب ہے آپ اس ملک میں رہنا پسند کرتے ہیں؟“

”نہیں۔ میں یہاں رہنا اتنا پسند تو نہیں کرتا۔ یہاں گندگی ہے' بے ایمانی ہے اور رشوت ہے۔ لاقانونیت ہے اور سیاستدان اسے لوٹ کر کھا گئے ہیں لیکن یار کڈ مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مجبور ہوں۔ یوں بھی اس عمر میں مجھے امریکہ کی ریاستوں اور قصبوں کے نام کہاں یاد ہوں گے۔ یہ جو کالا شاہ کاکو اور سبی اور کامونکی وغیرہ ہیں۔ یہ نام اب بھلائے نہیں جاتے' زبان پر چڑھ گئے ہیں اور اترتے نہیں۔ دریاؤں اور نہروں نے بھی میرے بدن میں راستے بنا لیے ہیں' ان سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ کیکر کے کانٹوں کے زخم بھی اچھے لگتے ہیں...... لیکن کڈ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آئندہ کوئی زندگی ملی تو تمہارے نقش قدم پر چلوں گا۔“

”انکل...... بیسٹ آف لک۔“ کڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنی ممی کی طرف چلا گیا جو اونگھ رہی تھیں اور اب فلائٹ کا اعلان ہوا تھا تو ہوشیار ہو گئی تھی۔ ممی کے بیگ پر بھی ”آئی لو پاکستان“ اور ”آئی لو اللہ“ کے سٹکر چسپاں تھے۔

اگرچہ یہ ایک کراچی کڈ تھا لیکن یہ ایک لاہوری یا اسلام آبادی کڈ بھی ہو سکتا تھا اور اس قسم کے کڈز کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

”وہ شادیاں پی پی کے موٹا ہو گیا تھا......“

ایک پرانے دوست سے یونہی سرِ راہ ملاقات ہو گئی...... سر راہ کچھ یوں ہوئی کہ میں اپنی بیگم کے حکم پر سلیپر گھسیٹتا نزدیکی مارکیٹ گیا' بیگم نے یہ حکم نہیں دیا تھا تم سلیپر گھسیٹتے مارکیٹ تک جاؤ بلکہ یہ کہا تھا کہ بچے گوشت کھا کھا کر سُست ہوتے جا رہے ہیں' میں نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں چست بنایا جائے اور لگاتار سبزیاں کھلائی جائیں تو ذرا لپک کر بازار جاؤ اور بھنڈیاں اور ٹینڈے وغیرہ لے آؤ۔ چنانچہ میں لپک کر یوں گیا کہ سلیپر گھسیٹتا چلا گیا...... بس وہاں اس دیرینہ دوست سے سر راہ ملاقات ہو گئی اور عجیب حالت میں ہوئی یعنی دیرینہ دوست عجیب حالت میں تھا۔ اپنی کار پارک کر کے اس میں سے برآمد ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش کی راہ میں اس کی تربوز نما توند بری طرح حائل تھی...... بہرحال سانس وغیرہ پر کچھ کنٹرول کر کے وہ کار میں سے بھک سے برآمد ہو گیا اور عین سامنے میں بھنڈیاں خرید رہا تھا...... اب میں چاہتا تو نہیں تھا کہ وہ مجھے ٹوٹے ہوئے سلیپروں میں اور لٹکتے ازاربند کے ساتھ بھنڈیاں خریدتا ہوا دیکھ لے اور شاید وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے کار میں سے پھنس پھنس کر نکلتا دیکھ لوں لیکن دونوں کی مجبوری تھی کہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے...... سلام دعا کے بعد میں نے پوچھا کہ یار آخری مرتبہ جب ملاقات ہوئی تھی تو تم خاصے سمارٹ تھے' اب ماشاءاللہ بھاری تن و توش کے مالک ہو گئے ہو تو کیا ہوا......؟

”آخری مرتبہ جب تم سے ملاقات ہوئی تھی تو شادی پر کھانے کی پابندی عاید نہیں ہوئی تھی' اس لیے سمارٹ تھا......“ وہ بیزار ہو کر کہنے لگا......

”بھئی اس حساب سے تو تمہیں پہلے سے بھی سمارٹ ہونا چاہیے کہ پلاؤ اور مرغن

کھانوں سے نجات ملی...... لیکن تم موٹے ہوگئے ہو۔"

"ہاں میں شادیاں پی پی کے موٹا ہو گیا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ شادیاں کھا کھا کے؟"

"بھئی نہیں۔ اب کھانے کو کہاں ملتا ہے...... صرف پینے کے لیے ملتا ہے...... ابھی ابھی ایک ولیمہ پی کر آرہا ہوں...... جھوٹ نہیں کہہ رہا' بلا مبالغہ کم از کم سات بوتلیں پی کر آرہا ہوں۔"

"تو موٹے کیسے ہوگئے؟"

"اب بھی پوچھتے ہو...... بھئی پہلے شادی یا ولیمے پر کھانا ملتا تھا...... میں دعوت ہو نہ ہو' بال بچوں کو بھی ہمراہ لے جاتا تھا...... ایک وقت کے کھانے کی بچت ہو جاتی تھی...... آؤٹنگ بھی ہو جاتی تھی...... اب شادی کی دعوت موصول ہوتی ہے تو رنگ فق ہو جاتا ہے...... گھر میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے...... بیوی کہتی ہے تمہارے رشتے دار ہیں...... تم ہو آؤ...... میں کہتا ہوں' نہیں تم حساب کر لو۔ تمہارے زیادہ نزدیکی بنتے ہیں' تم چلی جاؤ...... بہر حال مجھے ہی جانا پڑتا ہے...... کسی شادی ہال میں لوگ قطار اندر قطار بیٹھے جمائیاں لے رہے ہوتے ہیں...... جو ذرا عقلمند ہوتے ہیں' وہ گھر سے نمکو اور چپس وغیرہ لے آتے ہیں اور انہیں ٹھونگتے رہتے ہیں...... جو بہت عقلمند ہوتے ہیں' سینڈوچ بنوا کر لے آتے ہیں اور چوری چھپے کار میں جا کر کھا آتے ہیں...... اور جو بہت ہی عقلمند ہوتے ہیں' وہ دولہا اور دلہن کے باپ سے ہاتھ ملا کر تھوڑی سی ویڈیو بنوا کر غائب ہو جاتے ہیں......"

"بھئی یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ شادی کے موقع پر کھانے کے بغیر سخت بے رونقی ہوتی ہے بلکہ شنید ہے کہ جب سے کھانے پر پابندی عاید ہوئی ہے' شادیوں کی ناکامی کی شرح میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ کسی نے کسی کا بھی نمک تو کھایا نہیں ہوتا' صرف ایک بوتل پی ہوتی ہے تو لوگ صدق دل سے شادی کی کامیابی کی دعا مانگ ہی نہیں سکتے...... لیکن میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ تم موٹے کیسے ہوگئے؟"

"نہ یہ بات درست نہیں کہ آپ ولیمے اور شادی پر صرف ایک بوتل پیتے ہیں...... ہوتا یہ ہے کہ آپ وہاں پہنچتے ہیں تو ٹھاہ کر کے آپ کے ہاتھ میں ایک بوتل تھما دی جاتی ہے...... آپ اسے بمشکل نگلتے ہیں تو کوئی رشتے کے بھتیجے آپ کو سپاٹ کر لیتے ہیں۔ آہا چاچا جی آپ نے بوتل پی ہے...... اور اس سے پیشتر کہ آپ کچھ کہیں' وہ بوتل پیش کر دیتا ہے...... پھر دولہا کا والد مہربان ہو جاتا ہے کہ جی کمال ہے' آپ تکلف کر رہے ہیں۔ بوتل

پیجئے ناں' پی چکے ہیں تو ایک اور پیجئے گرمی بہت ہے...... اور یاد رہے کہ جب کھانے کا رواج ہوتا تھا تو یہ لوگ ادھر ادھر ہو جاتے تھے اور ہم ان کو تلاش کرتے رہتے تھے کہ بھئی روسٹ مرغ ختم ہو گیا ہے اور لائیں' اب ہم ان سے چھپتے پھرتے ہیں اور وہ ہمیں تلاش کرتے رہتے ہیں کہ جناب یہ والی بوتل ٹھنڈی ہے' ضرور پیجئے...... تو مائی ڈیئر تم خوب جانتے ہو کہ ان مشروبات میں بے شمار کیلریز ہوتی ہیں...... اگر آپ کھانا بالکل نہ کھائیں اور صرف تین بوتلیں پی لیں تو آپ کا کولسٹرول دنوں میں بڑھ جائے گا...... اب تم حساب لگا لو کہ اگر میں ایک مہینے میں سو ڈیڑھ سو بوتلیں پی جاتا ہوں تو موٹا نہیں ہوں گا تو اور کیا ہوں گا......"

"ویسے کھانے کی پابندی سے لوگوں کو فائدہ تو ہوا ہے؟"

"پتا نہیں کن لوگوں کو فائدہ ہوا ہے...... لاکھوں لوگ بیروزگار ہو گئے ہیں۔ کیٹرنگ بزنس ٹھپ ہو گیا ہے...... پولٹری فارم بند ہو گئے ہیں...... اشیائے خورد و نوش کی قیمت کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہیں۔ ہوٹلوں اور شادی ہالوں میں پہلے اگر دو سو روپے میں کھانا بھی کھلایا جاتا تو اب ڈیڑھ سو روپے فی شخص کے حساب سے صرف بوتلیں پیش کی جاتی ہیں اور بعد میں کسی اور مقام پر لے جا کر عزیزوں اور دوستوں کو چوری چھپے کھانا بھی کھلایا جاتا ہے...... اگر آپ کے نصف مہمان شہر سے باہر سے آئے ہیں تو انہیں بھوکا تو نہیں رکھنا...... اگر آپ دس کینال کی کوٹھی میں رہتے ہیں تو اپنے لان میں بے شک سو دیگیں چڑھا دیں اور اگر کسی محلے میں رہتے ہیں اور صرف گھر والوں کے لیے ایک دیگچہ چڑھاتے ہیں تو پولیس سونگھتی ہوئی آجاتی ہے بلکہ اب تو یہ بھی رواج ہو گیا ہے کہ لڑکی والے جہیز کے ساتھ وہ رقم بھی دیتے ہیں جو کھانے پر خرچ کی جانی تھی۔ ہم ہر شے میں مذہب ضرور لے آتے ہیں...... شادی کے کھانے میں بھی لے آئیں تو کیا حرج ہے...... دعوت ولیمہ کا تو قطعی طور پر حکم ہے' اجازت ہے...... اور ایک دوسرے کو کھانا کھلانے اور محبت بڑھانے کا بھی ذکر ہے۔"

"یار تم تو بہت دکھی ہو......"

"میں صرف دکھی نہیں' ایک موٹا دکھی پریم نگری ہوں۔ دولہا کے لیے تو شادی کے موقع پر سب سے شیریں فقرہ یہی ہوتا ہے ناں کہ لڑکے کو اندر لاؤ...... اور باراتیوں کے لیے یہ ہوا کرتا تھا کہ حضرات کھانا لگ گیا ہے...... تم ہی انصاف کرو کہ جب تک ساتھ والے ٹینٹوں سے دیگوں اور چمچوں کے کھڑکنے کی آواز نہ آئے' ادھر سے پلاؤ زردے کی لپٹیں نہ چلی آئیں' شادی کا ماحول بنتا ہے؟...... اب تو ہر جانب سناٹا ہوتا ہے۔ لوگ سوگوار پھرتے ہیں۔ بوتلیں پیتے ہیں اور لگتا ہے کہ یہ مشروب ان کی ناکوں اور کانوں سے رواں ہونے کو ہے......"

"تمہارے نزدیک اس کا کیا حل ہو سکتا ہے...... تم یہ تو مانتے ہو ناں کہ پہلے ان دعوتوں پر خوراک کو کیسے ضائع کیا جاتا تھا...... رزق کی کس طرح بے حرمتی کی جاتی تھی‘ درجنوں ڈشیں بنائی جاتی تھیں اور فضول خرچی کی انتہا ہو جاتی تھی‘ وہ بھی کسی طرح جائز نہیں...... اس کا بھی تو کوئی جواز نہیں......"

"بالکل نہیں...... ایسے لوگ تو معاشرے کے مجرم ہیں...... لیکن تم یہ بھی تو دیکھو کہ اس قسم کی فضول خرچی صرف راتوں رات امیر ہونے والے لوگ کرتے تھے...... بڑے کاروباری اور سیاستدان کرتے تھے...... عام لوگ تو بنیادی خوراک ہی پیش کرتے تھے۔ ہمارے ہاں گاؤں میں تو شادیاں صرف ایک حوالے سے ہی یاد رکھی جاتی تھیں کہ فلاں نے کھانا بہت اچھا کھلایا تھا اور برسوں تک یاد رکھا جاتا تھا اور گاؤں میں تم جانو برادری کے لوگ دور دور سے آتے ہیں شادی میں شرکت کرنے کے لیے...... اب آپ انہیں بھوکا بٹھائے رکھیں گے‘ کھانا کھلانے کی کوشش کرتے ہیں تو پولیس جو مجرموں اور قاتلوں کو تو پکڑ نہیں سکتی‘ دولہا اور اس کے والد کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دیتی ہے...... یہ زیادتی نہیں؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟"

"صرف ایک ڈش اور ایک میٹھے کی اجازت دے دی جائے...... اور وہ بھی حکومت فیصلہ کرے کہ ڈش کیا ہو گی...... قانون پاس کر دیا جائے کہ ہر شادی کارڈ پر...... دعوت نامے پر اس ڈش اور میٹھے کا اندراج ہو کہ جناب اس کے سوا کھانے کو اور کچھ نہیں دیا جائے گا اور پھر بے شک اس کی سختی سے پابندی کروائی جائے لیکن اب میں مزید بوتلیں نہیں پیوں گا...... مزید موٹا نہیں ہوں گا کیونکہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں آئندہ شادیوں میں نہیں‘ صرف جنازوں میں جایا کروں گا...... جہاں مرگ ہو گی‘ وہاں ضرور حاضری دیا کروں گا کیونکہ وہاں ہمیں کھانے کو تو ملتا ہے...... اب بھی ایک جنازے پر جا رہا ہوں...... خدا حافظ۔" میرا دیرینہ دوست پھر کار میں پھنس پھنس کر بیٹھا اور چلا گیا...... میں نے بھنڈیاں اور ٹینڈے خریدے اور سلیپر گھسیٹتا ہوا واپس آ گیا......

کیا زمانے آ گئے ہیں کہ لوگ شادیوں کے بجائے جنازوں پر جانا پسند کرتے ہیں......

☆☆☆

"تین چیزیں جو ہم پاکستانی نہیں چلا سکتے!"

حکمرانوں کے زیر سایہ رہنے میں بڑی عافیت ہوتی ہے‘ بڑی موج ہوتی ہے۔ اگر آپ اس سڑک پر رہتے ہوں جہاں کسی وزیر کا گھر ہے تو خاکروب روزانہ صفائی کے لیے آتا ہے۔ اگر وزیر مرکزی ہے تو کارپوریشن کی گاڑی چھڑکاؤ کرنے کے لیے موجود رہتی ہے اور واپڈا کے اہلکار کسی کھمبے کو بے بلب نہیں رہنے دیتے اور اگر آپ وزیراعظم کے آس پاس رہائش رکھتے ہیں تو پھر آپ کی عیش ہی عیش ہے۔ اگرچہ میں ماڈل ٹاؤن میں جو وزیراعظم کی قیام گاہ ہے‘ اس سے تقریباً پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ہوں لیکن حکمرانوں کا سایہ بہت لمبا ہوتا ہے اور میں تھوڑی سی کوشش کر کے ان کے زیر سایہ ہو جاتا ہوں اور بے حد معزز محسوس کرتا ہوں بلکہ ان عوام الناس کو چشم حقارت سے دیکھتا ہوں جن کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے میں اپنا نزدیکی پارک برائے سیر استعمال نہیں کرتا بلکہ خصوصی طور پر زیر سایہ رہنے کے لیے ماڈل ٹاؤن پارک پہنچتا ہوں اور ہر صبح وہاں چہل قدمی کرتا ہوں اور وزیراعظم کی آگسٹ موجودگی محسوس کرتے ہوئے نہایت فخر سے جوگنگ کرتا ہوں۔ کبھی کبھار حکمران قافلہ کی گاڑیاں اور حفاظتی دستے جب میرے قریب سے گزرتے ہیں تو میں اپنی کار سڑک کے کنارے کھڑی کر کے نہایت مؤدب ہو جاتا ہوں۔ کیا معلوم کب ہم پر نظر کرم پڑ جائے اور کسی وزارت یا سفارت کی پیشکش ہو جائے۔ اس علاقے میں مسلسل صفائی ہوتی رہتی ہے۔ کارپوریشن کے اہلکار روڈ سائن پینٹ کرتے رہتے ہیں اور پولیس کی موجودگی کی وجہ سے انسان نہایت محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اتوار کے روز میں باغ جناح میں سیر کے لیے جاتا ہوں اور اگر اس روز میاں صاحب جم خانہ کلب کی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے کے لیے آ رہے ہوں تو باغ کی تمام سڑکوں پر چھڑکاؤ کیا جا رہا ہوتا ہے اور شنید ہے کہ میاں صاحب کی سرزنش کی وجہ سے سکیورٹی کے اہلکار اب باغ میں نہیں

منڈلاتے بلکہ گراؤنڈ کے چاروں طرف جو درخت ہیں' ان پر چڑھ کر پتوں میں روپوش ہو کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں۔ یقیناً انہیں ٹریننگ کے دوران بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنا اور کسی ایک شاخ پر طویل عرصے تک بیٹھے رہنا یا کسی ٹہنی سے لٹکتے رہنا بھی سکھایا جاتا ہو گا لیکن پچھلے دنوں ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کرنے والے ایک صاحب کو حکمرانوں کا سایۂ عاطفت کام نہ آیا۔ وہ صبح سویرے پارک میں آئے۔ کار پارک کی تو چند حاجت مند آ گئے اور نہایت مؤدب ہو کر ان سے کار کی چابی مانگی۔ وہ اتنے مودب تھے کہ انہوں نے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ماؤزر اور کلاشنکوف صرف دکھائی' چلائی نہیں اور یوں نہایت پرامن طریقے سے کار ان کے ہاتھوں میں ٹرانسفر ہو گئی اور امن عامہ کی صورتحال بدستور اطمینان بخش رہی۔ کار لے جانے والے حضرات شاید شہر میں اجنبی تھے اور وزیراعظم کی رہائش گاہ کی قربت سے لاعلم تھے ورنہ وہ یہ گستاخی ہرگز نہ کرتے۔ اب کار پارک میں ایک عدد اونگھتا اور جمائیاں لیتا سپاہی موجود ہوتا ہے اور میں بے حد محفوظ محسوس کرتا ہوں۔

پارک میں اگرچہ دو گھڑیاں آویزاں ہیں لیکن وہ چلنے سے گریز کرتی ہیں اور ایک ہی مقام پر کھڑی ہو کر تماشائے اہل کرم دیکھتی ہیں۔ یہ وہ اہل کرم ہوتے ہیں جو سیر کے لیے آتے ہیں اور وقت دیکھنے کے لیے اپنی گھڑیاں ساتھ لاتے ہیں۔ ایک روز میں زبردستی خلیفہ خلفشاری کو بھی سیر کے لیے لے گیا۔ خلیفہ سیر سے بے حد اجتناب کرتے ہیں اور منیر نیازی کی طرح ان کا خیال ہے کہ پارکوں میں صبح سویرے صرف بیمار اور بوڑھے لوگ آتے ہیں اور لمبے لمبے سانس لے کر ہوا میں خطرناک قسم کے جراثیم چھوڑتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی صحت مند شخص کا پارک میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ وہ جتنا عرصہ پارک میں رہے' سانس ذرا روک کر سیر کرتے رہے۔ خلیفہ کی طبع قدرے قنوطی واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ منہ بسورے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر نہایت ناراض لہجے میں بولے۔ "تمہارے اس پارک میں گھڑیاں کیوں نہیں چلتیں؟"

"مجھے کیا پتہ کیوں نہیں چلتیں؟" میں نے بھی ناراض لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے پتا ہے کہ کیوں نہیں چلتیں۔"

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اتنے باشعور ہو کہ اپنی قوم کی نفسیات جان سکو۔"

"ایک رکی ہوئی گھڑی اور ہماری قوم کی نفسیات کا آپس میں کیا تعلق ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"بہت گہرا اور بنیادی تعلق ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہماری قوم نہیں چلا سکتی اور ان میں سے پہلی چیز گھڑی ہے۔"

خلیفہ اکثر اوقات اسی قسم کی اوٹ پٹانگ گفتگو کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے محض وقت گزارنے کی خاطر کہا "ذرا اس بیان کی وضاحت کیجیے۔"

"میں نہایت سنجیدگی اور گہرے دکھ سے یہ بات کر رہا ہوں اور تم پر لازم ہے کہ میری اس بات کو پوری سنجیدگی سے سنو اور یہ جو احمقانہ مسکراہٹ تم نے اپنے چہرے پر سجا رکھی ہے' اسے ختم کرو۔"

چنانچہ میں نے بقول خلیفہ جو احمقانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا رکھی تھی۔ اسے سمیٹا اور پوری سنجیدگی سے سیر کرنے لگا اور اس کی بات سننے لگا۔

"میں صرف لاہور کی بات نہیں کر رہا' پورے پاکستان کی بات کر رہا ہوں کہ یہاں جتنی بھی سرکاری عمارات ہیں' پارک اور پلازے میں وہاں جتنی بھی گھڑیاں اور گھڑیال اور کلاک وغیرہ ہیں' ان میں سے چند ایک کے سوا سب کی سوئیاں رکی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ وقت ہمارے لیے اہمیت نہیں رکھتا۔ مجھے آزادی سے پہلے لاہور یاد ہے۔ مال روڈ پر جتنے کلاک تھے' وہ سب کے سب درست وقت دیتے تھے۔ ان کے گھڑیال بجتے تھے۔ ڈنگا سنگھ بلڈنگ' لکشمی مینشن' جی پی او' دیال سنگھ مینشن' پنجاب یونیورسٹی' ٹاؤن ہال وغیرہ۔ ریلوے سٹیشن کا گھڑیال بھی منادی دیتا تھا اور ان زمانوں میں ڈیجیٹل کلاک اور بجلی کی گھڑیاں وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ ان بلند عمارتوں کے گنبدوں میں پہنچ کر انہیں باقاعدہ چابی دے کر چلایا جاتا تھا۔ جونہی ہم آزاد ہوئے' ان میں سے بیشتر کلاک تھم گئے۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال ہے۔ اب اس ماڈل ٹاؤن پارک میں کلاک چلانے کے لیے صرف بجلی کی ایک تار یا بیٹری سیل درکار ہیں یا کوئی ایسا شخص جو ہر مہینے ان کی سوئیاں درست کر دے لیکن ہم کروڑوں کی یادگاریں بنا سکتے ہیں۔ اپنی تعریف میں خود ہی ڈفلیاں بجا سکتے ہیں لیکن گھڑیاں نہیں چلا سکتے۔ اس لیے کہ ہمارے لیے وقت کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"میاں صاحب نے تو شنید ہے کہ امریکہ سے ایک نہایت مہنگی گھڑی خریدی تھی' کم از کم انہیں تو وقت کی اہمیت کا احساس ہے۔"

"ان کی گھڑی بھی چیک کر لیناوہ بھی کھڑی ہو گی یا غلط وقت بتا رہی ہو گی۔"

"چلیے ایک چیز تو گھڑی ہے جو ہم سے نہیں چل سکتی اور دوسری چیز کیا ہے؟"

"سبیل ...."

”سبیل ؟ کون سی سبیل ؟“

”بھئی پانی پینے کے لیے جو سبیل بنائی جاتی ہے۔ تم پورے شہر میں گھوم جاؤ‘ یہاں اہلِ ثروت کے ثواب کی خاطر بے شمار سبیلیں بنا رکھی ہیں۔ ان پر بڑے بڑے بورڈ اور افتتاحی پتھر نصب ہیں جن پر جلی حروف میں ان اہل ثروت کے نام اور سماجی درجات لکھے ہوئے ہیں لیکن کہیں بھی تم ان میں سے ایک سبیل دکھا دو جو رواں ہو جس میں پانی ہو‘ جہاں سے راہگیر اپنی پیاس بجھا سکیں۔ البتہ سلور کے ٹیڑھے میڑھے گلاس زنجیروں سے لٹک رہے ہوں گے تاکہ اہل ایمان ان کو چوری نہ کر سکیں۔ آزادی سے پہلے ہر جگہ نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے لیے بھی پانی کی سبیلیں تھیں اور ان میں پانی موجود ہوتا تھا۔“

”بھئی خلیفہ آزادی کے لیے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔ ٹھیک ہے ہم گھڑیاں اور سبیلیں نہیں چلا سکتے‘ ایٹم بم تو چلا سکتے ہیں۔“

خلیفہ خلفشاری کے پاس میری اس شاندار دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ ”دیکھو خلیفہ...... ہم نے گھڑیاں چلا کر کیا کرنی ہیں۔ پوری دنیا کی گھڑیاں چلتی ہیں۔ ہم ان سے وقت پوچھ لیا کریں گے۔ یوں بھی ہم نے اپنے تابناک ماضی کو یاد رکھنا ہے اور وقت کو وہیں ٹھہرائے رکھنا ہے۔ اسی لیے ہماری گھڑیاں وہیں رکی ہوئی ہیں اور سبیلوں کی بھی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ہم منرل واٹر پی سکتے ہیں۔ بوتلوں اور ڈبوں میں بند مشروبات پی سکتے ہیں۔ گھڑیوں اور سبیلوں کو چلا کر ہم نے کیا کرنا ہے‘ ایٹم بم چل گیا تو سمجھو سب کچھ چل گیا۔“

خلیفہ خاموش رہا۔ مجھے اس پر مزید ترس آیا۔ ”اچھا تو خلیفہ تم نے شروع میں کہا تھا کہ تین ایسی چیزیں ہیں جو ہم پاکستانیوں سے نہیں چل سکتیں۔ گھڑی اور سبیل نہیں چل سکی۔ تیسری چیز کیا ہے جو ہم سے نہیں چل سکتی!“

”ملک......“

”کیا مطلب ؟“

”چوبیس برس میں ہی اسے دو ٹکڑے کر دیا تھا ناں...... تو ہم سے ملک بھی نہیں چل سکتا۔“

خلیفہ خلفشاری اگرچہ قنوطی شخص ہے لیکن ذرا غور کرنا چاہیے کہ کہیں اس کا تھیس درست تو نہیں۔ ہم پاکستانیوں سے تین چیزیں نہیں چلتیں گھڑی‘ سبیل اور ملک......!

☆☆☆

”شہر کی سوغات اور سینئر شاعر“

یہ ان زمانوں کا قصہ ہے جب ہمیں محفلوں میں مدعو کیے جانے اور صدارتیں کرنے کا بڑا اشتیاق ہوا کرتا تھا۔ کہیں سے بھی فون آتا تو ہم فوراً کہتے کہ جی بے شک کوئی سی بھی تاریخ رکھ لیں‘ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ مصروفیت تو بہت ہے لیکن ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقت تو نکالنا پڑتا ہے اور جس روز فنکشن ہونا ہوتا‘ اس روز صبح سویرے ہی ہم مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو جاتے اور بال بچے بھی ذرا پرے پرے رہتے کہ آج اباجی‘ انجمن پھل فروٹ فروشاں گلی نمبر 4‘ اندرونی بھاٹی گیٹ کے جلسے کی صدارت کر رہے ہیں‘ ان کے قریب جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا البتہ جب واپس آئیں گے تو اپنے ہمراہ تربوز اور خربوزے وغیرہ لائیں گے۔ اس روز جن دوست احباب کے فون آتے یا ملاقات ہوتی تو انہیں بھی کسی نہ کسی بہانے اطلاع دے دی جاتی کہ آج ہم بہت مصروف ہیں‘ صدارت کر رہے ہیں اور یہ ان زمانوں کی بات ہے جب خیر سے جنرل ضیاء الحق صدارت فرما رہے تھے‘ اس لیے انجمن پھل فروٹ فروشاں کے جلسے کی صدارت میں بھی بڑی دہشت تھی۔ اِن زمانوں میں چونکہ صورت حال بدل چکی ہے‘ اس لیے ہم نے بھی بے فائدہ صدارتیں کرنی چھوڑ دی ہیں۔ بہر حال اُن دنوں ایک بار ہمیں بہاولپور یونیورسٹی کے ایک فنکشن کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا اور ہم شدید گرمیوں میں اپنی اس آتش شوق کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کشاں کشاں وہاں پہنچ گئے۔ ایک مشاعرے کا بھی اہتمام تھا اور چند شاعر حضرات بھی ریسٹ ہاؤس میں فروکش تھے۔ شام ہوئی تو طلبہ تنظیم کے صدر اور چند اراکین آ گئے کہ ہم آپ کو بہاولپور دکھانا چاہتے ہیں اور ہم بہاولپور دیکھنا چاہتے تھے‘ اس لیے موقع غنیمت جانا اور جھٹ سے تیار ہو گئے۔ ہمیں تیار ہوتے دیکھ کر

ایک سینئر شاعر بھی جھٹ سے تیار ہو گئے۔ کاروں میں سوار ہو کر ہم نے شہر کا ایک چکر لگایا اور عزیز صاحب ہمیں معروف مقامات سے آگاہ کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد سینئر شاعر کہنے لگے "بھئی برخوردار شہر تو ہم نے بہت دیکھ لیا' اب یہ بتاؤ کہ اس شہر کی سوغات کیا ہے؟" اب برخورداروں کو بھی کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا کہ اس شہر کی سوغات کیا ہے' چنانچہ سینئر شاعر فوراً مدد کو آ گئے۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس شہر کیا کیا سوغاتیں ہیں ...... کھسّے نہایت دیدہ زیب ملتے ہیں' چنری کا کام بہت عمدہ ہوتا ہے' صراحیاں لاجواب بنتی ہیں اور یہاں کا حلوہ تو پورے پاکستان میں مشہور ہے تو ذرا ادھر چلو جہاں سے یہ سب کچھ ملتا ہے۔" چنانچہ ہم ادھر چلے گئے' کھسّوں کی دکان میں شاعر موصوف نے نہ صرف اپنے لیے دو قیمتی کھسّے پسند کیے بلکہ اپنے ہینڈ بیگ میں سے اپنے اہل خاندان کے ناپ برآمد کر کے ان کے لیے بھی یہ تحفے پسند کیے' میرے کان میں کہنے لگے۔ "بھئی تم بھی تو کچھ پسند کرو' بچوں کا دل توڑنا مناسب نہیں۔" میں نے کہا "سر یہ سٹوڈنٹ لوگ ہیں' بڑی مشکل سے فنکشن کروا رہے ہیں تو ان کے پاس پیسے نہیں ہوں گے۔" وہ مسکرا کہ کہنے لگے۔ "ہو ناں نثر نگار...... شاعر نہیں ہو' بھئی ان سٹوڈنٹ لوگوں کے یونین فنڈ میں لاکھوں روپے ہوتے ہیں' دو چار ہزار ہم پر خرچ کر دیں گے تو کیا قیامت آ جائے گی' تم بے دریغ شاپنگ کرو۔" کھسّے حاصل کرنے کے بعد کڑھائی والے کرتے اور دوپٹے وغیرہ پسند کیے گئے اور واپسی پر مٹھائی کے ڈبے بھی احتیاطاً حاصل کر لیے گئے' اس مال غنیمت میں سے کچھ مجھے بھی مل گیا۔ سینئر شاعر کا کہنا تھا کہ یہ لوگ موچی سے جوتے میں ایک ٹانکا لگواتے ہیں تو ادائیگی کرتے ہیں' ڈاکٹر سے مشورہ کرتے ہیں تو فیس دیتے ہیں تو شاعر کو ادائیگی کیوں نہیں کرتے۔ ہم اتنی دور سے ان کے لیے آتے ہیں' دو تین دن ضائع کیے ہیں تو بچوں کے لیے کچھ تحفے بھی نہ لے کر جائیں اور مجھے سینئر شاعر کے اس استدلال سے اتفاق تھا۔ احسان دانش صاحب نے اسی لیے اپنے گاؤ تکیے کے پیچھے دیوار پر اندرون لاہور اور بیرون لاہور کے مشاعرے کے الگ الگ ریٹ آویزاں کر رکھے تھے اور ان کہنا درست تھا کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کر لے تو کھائے کیا......

مگر اب زمانے بدل چکے ہیں' شاعروں اور ادیبوں کے باقاعدہ سٹاک ایکسچینج ہیں اور ان کے شیئرز کی قیمت میں اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے لیکن زمانے کے ساتھ ادائیگی کا طریقۂ کار بھی یکسر بدل چکا ہے۔ کراچی کا جانے کیا حال ہے لیکن گرمیاں شروع ہوتے ہی لاہور کی ادبی سرد گرمیاں یکدم گرم گرمیاں ہو جاتی ہیں۔ شہر پر ممالک غیر میں

مشاعرے اور ادبی تقریبات منعقد کروانے والے حضرات کی یلغار ہو جاتی ہے۔ مقامی شائقین ان کے اعزاز میں محفلیں برپا کرنے لگتے ہیں۔ مرغن کھانے کھلا کھلا کر ان کا پیٹ خراب کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں "بک" کر لیں۔ چنانچہ شہر لاہور کے بیشتر شعراء اور ان میں زیادہ تعداد ان شعراء کی ہوتی ہے جن کے بارے میں پہلی بار علم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ یہ بھی شاعر ہیں' بک ہو جاتے ہیں بلکہ گرمیوں میں اگر کوئی شاعر لاہور میں نظر آ جائے تو اس کی سخت بے عزتی ہوتی ہے کہ تمام گرانقدر شعراء تو امریکہ' یورپ اور مڈل ایسٹ کو رحلت فرما چکے ہوتے ہیں۔ پچھلے برس چند شعراء پورے امریکی سرکٹ کے لیے 'بک ہو کر نیویارک پہنچے جہاں ان کے چاہنے والوں نے انہیں ایک بڑے تہہ خانے میں ٹھہرایا۔ ریفریجریٹر میں کچھ ڈبل روٹی اور ٹماٹر وغیرہ رکھ دیئے کہ سینڈوچ بنا کر کھائیں اور عیش کریں...... تہہ خانے میں سردی اتنی زیادہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ ان کی بیاضیں بھی سکڑ گئیں۔ شنید ہے مانگ تانگ کر وطن واپس آئے لیکن یہاں کے ادبی اخباروں میں ان کے دورۂ امریکہ اور ان کے اعزاز میں منعقد کی جانے والی شاندار ادبی نشستوں کی تفصیل بڑی دھوم دھام سے شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ شاعروں نے اپنی فلاح و بہبود کا ایک اور طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ شنید ہے کہ اب ٹھیکے پر بھی کام ہو جاتا ہے۔ ممالک غیر میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن میں کہیں نہ کہیں شاعر بننے کی آرزو سلگتی ہے' اس آرزو کو مزید سلگا کر الاؤ بنانے کا فریضہ نہایت صدق دل سے سرانجام دیا جاتا ہے یعنی کتاب کے لیے کل اتنے شعر لکھ کر دیئے جائیں گے' دیوان چھپوایا جائے گا اور پھر اس کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا جائے گا' صرف اتنے ہزار ڈالر میں...... البتہ فلیپ لکھوانے کا معاوضہ الگ ہو گا...... یوں فروغ اردو بھی ہوتا ہے اور فروغ مے بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے...... پچھلے دنوں ایک ادبی جریدے نے امریکہ میں مقیم ایک ادبی ذوق رکھنے والے صاحب کے بارے میں خصوصی نمبر نکالا جس میں ان کے اہل خانہ کی تصاویر کو نمایاں جگہ دی گئی تھی اور ان کے نہایت متمول ہونے کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ موصوف کسی قسم کے بھی ادیب نہ تھے' صرف متمول تھے۔

کچھ عرصہ پیشتر لاہور کے ادبی افق پر ایک صاحب طلوع ہوئے' انہیں سازدل پُر درد کہہ لیجئے...... ہر ادبی اور غیر ادبی محفل میں پائے جاتے ہیں بلکہ پہنچ جاتے ہیں' وہاں کوئی نہ کوئی خیر خواہ یکدم اعلان کرتا ہے کہ خواتین و حضرات یہ کیسا حسین اتفاق ہے کہ آج جناب سازِ دل پُر درد ہمارے درمیان موجود ہیں' امریکہ میں مقیم ہیں'

ترویج ادب برائے انسانیت ان امریکہ کی تنظیم کے بانی ہیں' وہاں مشاعرے اور ادبی محافل برپا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجموعہ کلام چھپوانے کی غرض سے چند روز کے لیے ہمارے شہر میں قدم رنجا فرمایا ہے۔ کیوں نہ ان سے گزارش کی جائے کہ اپنے کلام سے ہمیں نوازیں......اور وہ صاحب کلام سے اس طرح نوازتے ہیں کہ ساری شام ترنم سے گنگناتے اور پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی محفل میں کوئی خیر خواہ موجود نہ ہو تو خود ہی اپنے خیر خواہ بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خواتین و حضرات یہ میری خوش بختی ہے کہ آپ ایسے ادب نواز یہاں جمع ہیں تو ایک گیت پیش کرتا ہوں...... چھ ماہ ہو گئے ہیں اور ابھی تک امریکہ واپس نہیں گئے ......البتہ ان کے خیر خواہ مایوس ہوتے جاتے ہیں کہ یہ خود امریکہ نہیں جارہے تو ہمیں کیا لے کے جائیں گے۔ اسی طور ایک فنکشن میں امریکہ سے آئی ہوئی ایک خاتون کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا کہ تارڑ صاحب یہ ہیں معراج بی بی عرف نازو صاحبہ...... شمالی امریکہ میں اردو کی سب سے بڑی افسانہ نگار......وہ بھی مداحین کے گھیرے میں تھیں جو لپک لپک کر ان کے افسانوں کی توصیف کر رہے تھے۔ انہوں نے نہایت انکساری سے بتایا کہ جی سکول کے زمانے میں ادب کا بڑا شوق تھا...... پھر شادی کے بعد امریکہ چلی گئی' تیس برس سے ہم وہاں سیٹل ہیں' بال بچے شادی شدہ ہیں۔ دو برس پیشتر ہماری کمیونٹی نے مشاعرہ کروایا تو دو شاعر ہمارے حصے میں آئے جو ہمارے گھر ٹھہرے...... میں نے انہیں اسکول کے زمانے کا ایک افسانہ سنایا تو وہ تو پیچھے ہی پڑ گئے...... کہنے لگے آپ کو تو باقاعدہ افسانہ نگاری کرنی چاہیے...... میں بھی فارغ تھی' چنانچہ باقاعدہ افسانہ نگاری ہی کرنے لگی' انہوں نے کتاب بھی چھپوادی اور فنکشن بھی کروادیا۔ ایک فنکشن امریکہ میں بھی کرواؤں گی جس کے لیے بندے لینے آئی ہوں...... آپ کیا کرتے ہیں......؟ اگر ادیب وغیرہ ہیں تو آپ کو بھی بلالوں گی۔ اس پر ان دو میں سے ایک شاعر جنہوں نے موصوفہ کو باقاعدہ افسانہ نگاری پر مائل کیا تھا' چہک کر بولے ''تارڑ صاحب' بھابھی پلاؤ بہت اچھا بناتی ہیں' آپ فنکشن کے بعد مجھ سے رابطہ کیجئے گا...... بہت سادہ دل خاتون ہیں' ہر ایک کو دعوت دے ڈالتی ہیں لیکن میں بھی سفارش کروں گا' انشاء اللہ امریکہ کا ٹکٹ آئے گا' خاطر جمع رکھیں......''

میں نے عرض کیا تھا ناں کہ گرمیاں شروع ہوتے ہی لاہور کی ادبی سرد گرمیاں گرم گرمیوں میں بدل جاتی ہیں' میں خاطر جمع کر کے بیٹھا ہوں کہ امریکہ سے

ٹکٹ آئے گا...... وہ دن لد گئے جب حضرت احسان دانش کہتے تھے کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کرلے تو کھائے کیا......اب تو گھاس کھانے کے لیے اس سے دوستی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے شعر سننے پڑتے ہیں۔ توصیفی مضمون لکھنے اور پڑھنے پڑتے ہیں......ادیب اور شاعر اور گھوڑا اب یہ نہ کرے تو بھوکا مر جائے......سیاستدانوں کی طرح ہمارے لیے بھی امریکی گھاس بہت ضروری ہے۔



”مجھے تو روزہ بہت کچھ کہتا ہے......“

قارئین لوگوں کا کہنا ہے کہ اِن دنوں کا روزہ کچھ نہیں کہتا، پتا نہیں ان کو کیوں نہیں کہتا، مجھے تو بہت کچھ کہتا ہے۔

اُن کا کہنا ہے کہ ادھر سحری کے پراٹھے ہضم نہیں ہوتے۔ لسّی کی ٹھنڈک ابھی گلے میں موجود ہوتی ہے، افطار کا وقت آن پہنچتا ہے۔ بارہ گھنٹے سے کم کا روزہ بھی کوئی روزہ ہوتا ہے اور پھر بونس یہ کہ سردیوں کا موسم۔ نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیاس۔ ان دنوں تو آٹھ پہر کا روزہ رکھنا چاہیے تاکہ کچھ تو آزمائش ہو۔ ان دنوں کا روزہ کچھ نہیں کہتا۔ لیکن جناب میں بے حد شرمندگی سے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے ان دنوں کا روزہ بھی بہت کچھ کہتا ہے۔

سحری کھانے کے بعد پارک میں سیر کے لیے نکل جاتا ہوں، واپس آتا ہوں تو سب کچھ ہضم ہو چکا ہوتا ہے اور ناشتے کی طلب ہونے لگتی ہے۔ چائے یاد آتی ہے، دن کا پہلا سگریٹ یاد آتا ہے۔ پٹرول کی قیمت میں اضافہ یاد آتا ہے اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ انہی دنوں جب یہ اضافہ مجبوراً اس لیے کیا گیا تھا کہ بین الاقوامی منڈی میں تیل کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں، میں نے ایک رپورٹ میں پڑھا کہ تیل کی قیمتیں تو پہلے سے بھی کم ہو گئی ہیں۔ البتہ ادھار لینے والی غیور قوموں کو قیمت زیادہ دینی پڑتی ہے کیونکہ اس میں سود در سود بھی شامل ہوتا ہے یعنی قرض کی یہ وہ مے ہے جسے ہم پیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ فاقہ مستی ایک دن رنگ لائے گی......بلکہ لاچکی ہے۔ لاحول ولا......روزہ رکھ کر میں شراب کی بات کر رہا ہوں۔ تو جناب پارک سے واپسی پر یہ سب کچھ یاد آتا ہے اور پھر جوں جوں دوپہر نزدیک آتی ہے تو آج تک جن ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، ان کے مینو کارڈ پر درج تمام خوراکوں کی خوشبو مجھے تنگ کرنے لگتی ہے۔ یہ خوراکیں میرے سامنے تیار ہو رہی ہوتی ہیں اور جس

دیگچی کا ڈھکن اٹھاتا ہوں، اس میں سے طرح طرح کے مصالحوں اور دیسی گھی کے تڑکے کی مہک برآمد ہوتی ہے اور میں انہیں سونگھ سونگھ کر نڈھال ہوتا ہوں۔ یہ نہیں کہ بھوک اور پیاس ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں اور یہی مصیبت ہے۔ اگر بھوک سے نقاہت طاری ہو جائے اور پیاس سے حلق میں کانٹوں کی فصل اُگنے لگے تو انسان خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہ اس کے تشخص و وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ خود پر عائد کردہ اس پابندی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ہر افطار کے بعد فخر محسوس کرتا ہے کہ میں نے اپنے رب کی رضا کے لیے اپنے آپ کو بھوکا اور پیاسا رکھا...... لیکن ان روزوں میں نہ نقاہت طاری ہوتی ہے اور نہ بھوک پیاس کا وہ غلبہ ہوتا ہے کہ آپ اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ بس یہی مصیبت ہے کہ ہر شے نارمل ہے اور پھر بھی کھانے پینے پر پابندی ہے......اللہ بخشے میری والدہ محترمہ بڑی باقاعدگی اور شوق سے روزے رکھا کرتی تھیں اور ان میں سے بیشتر وہ روزے تھے جو شدید گرمیوں کے زمانے میں، فریج اور ایئر کنڈیشنر کی آمد سے پہلے کے وقتوں میں آتے تھے۔ والدہ ہم سب سے پہلے بیدار ہو کر چولہا گرم کرتیں، یاد رہے کہ ان دنوں گیس کا نزول بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے گیلی لکڑیوں میں پھونکیں مار مار کر سلگایا جاتا تھا۔ پھر پورے خاندان کے لیے پراٹھے بناتیں، سالن تیار کرتیں، لسّی کا بندوبست کرتیں اور پھر سحری کے اختتام سے پندرہ منٹ پہلے سب کو جگاتیں اور ہم آنکھیں ملتے ہوئے چولہے کے پاس چنگیر کے گرد جا بیٹھتے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ انہیں ہمیں کھلاتے پلاتے سحری کھانے کا وقت ہی نہ ملتا اور وہ شتابی سے ایک مگ چائے پی کر روزہ رکھ لیتیں۔ دن کے وقت صرف روزہ رکھنے کی وجہ سے ان کے معمولات میں کوئی کمی نہ آتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، بستروں کو لپیٹ کر ٹین کی پیٹی میں سنبھالنا۔ ہمیں سنبھالنا...... پھر غسل خانے میں ایک چوکی پر بیٹھ کر بھری دوپہر میں کپڑے دھونا اور خاص طور پر کھیس اور چادروں کو ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر صاف کرنا۔ اس معاملے میں وہ دھوبی پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ انہیں دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں سے ہمیشہ مشک آتی تھی کہ پتہ نہیں یہ کمبخت کن ناپاک اور گندے نالوں میں کپڑے دھوتے ہیں۔ شلوار قمیضوں اور بنیانوں وغیرہ کو دھلوانا تو مجبوری تھی لیکن بستر کی چادروں اور کھیسوں کو وہ دھوبی سے دھلوانے کا رسک نہیں لیتی تھیں......باہر کھلے صحن میں درجہ حرارت 110 سے کہیں اوپر تجاوز کر جاتا اور اتنی گرمی ہوتی کہ صحن کی اینٹوں پر انڈے فرائی کیے جا سکتے تھے اور وہ کھیسوں کو زد و کوب کر رہی ہوتیں۔ گرمی اور پیاس سے بے حال ہوتیں تو پانی کے دو چار ڈونگے اپنے سر پر بھی ڈال لیتیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ افطاری

کے بندوبست میں جُت جاتیں......اور ہم مکان کے اندر پنکھوں تلے خس کی چکوں کی مہک میں مست سوتے رہتے...... عمر کے آخری دنوں تک وہ روزے کی پابند رہیں......اور میں اب ان کے ہاتھوں کے دھلے ہوئے کھیسوں کی مہک کو ترستا ہوں۔ یہ وہ دن تھے جب لوگ کسی کے کہنے پر نہیں اپنی من مرضی سے اپنی خوشی سے روزے رکھتے تھے۔ ماہ رمضان کی اپنی ایک ثقافت تھی۔ جو لوگ روزے نہیں رکھ سکتے تھے' ان کے لیے ہوٹلوں کے آگے چکیں ڈال کر کھانے کا بندوبست کر دیا جاتا تھا اور پولیس چھاپے نہیں مارتی تھی اور روزہ خوروں کی گرفتاریاں عمل میں نہیں لائی جاتی تھیں۔ کوئی زبردستی نہیں تھی اور اس کے باوجود ان دنوں آج کی نسبت احترام رمضان زیادہ موثر تھا۔

میں جب بھی روزہ رکھتا ہوں تو پہلے میری والدہ محترمہ کا چہرہ سامنے آتا ہے' ہونٹوں پر پیاس سے پپڑیاں جمی ہوئیں' گھر کے کام کاج میں مصروف اور پھر کہیں ماضی کے دھندلکوں میں سے میری نانی جان کا سرخ و سفید جھریوں سے بھرا چہرہ نمودار ہو جاتا ہے اور پھر وہ پہلا روزہ جو میں نے ان کے ساتھ رکھا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب میں اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ جانگیے کی بجائے اب نیکر پہنتا تھا۔ سکول کی قید ابھی دور تھی اور میں گاؤں میں اپنی بے بے جی کے پاس تھا۔ رکھنے کو تو میں نے روزہ رکھ لیا لیکن سحری کے فوراً بعد سورج نکلتے ہی میں نے فرمائش کی کہ اب میں روزہ کھولنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ شہر میں تو اسی طرح ہوتا تھا کہ بچوں کے اصرار پر انہیں سحری کھلا دی جاتی تھی اور جب ان کے چہرے مرجھانے لگتے تھے تو انہیں کہا جاتا تھا کہ بس تمہارا روزہ کھلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ کچھ کھا پی کر پھر روزہ رکھ لیتے تھے اور یوں دوچار افطار کے بعد بڑی افطاری میں بھی بڑے فخر سے شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن اس روز سانحہ یہ ہوا کہ نانی جان نے کہا کہ نہیں بیٹے آج تو تمہارا سچ مچ کا روزہ ہے اس لیے کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ صبر کرو...... میں نے کچھ دیر صبر کیا اور پھر پوچھا کہ اب وقت ہو گیا ہے۔ اس پر نانی جان کہنے لگیں' پُتر میں نے ابھی روزہ کھولنے کا کوئی بندوبست کرنا ہے۔ جب یہ ہو جائے گا تو تم روزہ کھول لینا۔ میں نے پوچھا یہ بندوبست کیسے ہو گا؟ انہوں نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولیں' تم پسار میں جا کر لیٹ جاؤ میں جولاہوں کے گھر سے بادام لے کر آتی ہوں' انہیں پیس کر دودھ میں ملائیں گے اور پھر دونوں مل کر روزہ کھولیں گے۔ اس کے بعد نانی جان جو جولاہوں کے گھر گئی ہیں تو واپس آنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ میں انتظار کرتے کرتے اونگھ گیا۔ وہ جب واپس آئیں تو ان کے دوپٹے کے پلو میں مٹھی بھر بادام بندھے تھے۔ انہوں نے باداموں کو ایک کچے پیالے میں پانی ڈال کر بھگو دیا۔ اب کیا ہو گا؟ میں نے

بے چینی سے پوچھا...... بیٹے اب یہ بادام اچھی طرح بھیگ جائیں گے تو پھر ہم دونوں ماں بیٹا مل کر ان کے چھلکے اتاریں گے۔ پھر انہیں کونڈی میں پیس کر ان میں دودھ اور چینی ملائیں گے اور پھر روزہ کھول لیں گے۔ قصہ مختصر پہلے بادام بھیگتے رہے اور میں پیالے کے آس پاس ٹہلتا رہا کہ کب مکمل طور پر بھیگتے ہیں اور جب دوپہر ہو گئی تو نانی جان نے ایک بادام کا چھلکا اتار کر اعلان کیا کہ بس اب کام تیار ہے۔ پھر ہم دونوں مل کر ان باداموں کو چھیلتے رہے۔ باداموں کی ان سفید گریوں کو کونڈی میں ڈال کر کوٹنے اور پیسنے کا عمل بھی دیر تک جاری رہا۔ اور بالآخر جب ان میں دودھ اور چینی ملا کر گھولا گیا تو شام ہونے والی تھی۔ گاؤں کی مسجدیں ان دنوں لاؤڈ سپیکرز سے مزین نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہاں ایک نوبت ہوتی تھی جسے افطار کے وقت بجایا جاتا تھا۔ چنانچہ نوبت کی آواز کا انتظار ہونے لگا اور خدا خدا کر کے افطار کا وقت آیا۔ پسے ہوئے باداموں والا دودھ مجھے آج تک یاد ہے۔ میرے پہلے روزے کی خوشی میں بے بے جی نے مجھے چاندی کا ایک روپیہ دیا اور محلے کے بچوں میں بوندی کی مٹھائی بانٹی۔ چاندی کا روپیہ تو میں نے بخوشی قبول کیا لیکن مٹھائی والی بات مجھے پسند نہ آئی کہ روزہ تو میں نے رکھا تھا یہ محلے کے بچے کس سلسلے میں عیش کر گئے ہیں۔

ان دنوں افطاریوں کا رواج بھی کم کم تھا۔ بلکہ افطاری کو ایک پرائیویٹ افیئر سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی دعوت افطاری ہوتی تھی تو اس میں مدعو لوگوں کا روزہ بھی ہوتا تھا۔ آج کل تو افطاری پر مدعو کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ جی یہ فرمائیے کہ یہ افطاری ہے کتنے بجے۔ میں نے ایک افطار پارٹی کے کارڈ پر یہ لکھا بھی دیکھا ہے کہ وقت پانچ سے سات بجے اور اکثر مہمان وقت افطار سے پہلے ہی ہر شے کو چکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس میں نمک تیز ہے اور یہ سموسے ٹھنڈے ہیں۔ سیاسی افطار پارٹیوں میں یہ دیکھنے میں بھی آیا کہ جن لوگوں کے روزے تھے بوقت افطار ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور ایک آدھ کھجور یا کیلے پر ہی اکتفا کرتے رہے کیونکہ دیگر جیالے اور متوالے جن کی فقہ ان سے مختلف تھی انہوں نے اپنے عقیدے کے مطابق سورج غروب ہونے سے پیشتر ہی سامان افطار پر دھاوا بول دیا تھا۔ ایسی پارٹیوں پر پارٹی لیڈر اپنی رہائش گاہ سے باہر لان میں آتے تھے تو منہ پونچھتے ہوئے آتے تھے اور کہتے تھے بھئی آپ شروع کریں ناں انتظار کیوں کر رہے ہیں اور کوئی ایک آدھ روزہ دار ڈرتے ڈرتے عرض کرتا تھا کہ وہ جی ابھی وقت نہیں ہوا تو پوچھا جاتا تھا کس چیز کا وقت اور جب بتایا جاتا تھا کہ افطار کا وقت تو میزبان بڑی دانائی سے سر ہلا کر کہتے تھے' ہاں جی بالکل' احترام رمضان ہم سب پر واجب ہے۔

لیکن اس سلسلے میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے کہ پہلے کی نسبت نوجوان نسل زیادہ روزے رکھتی ہے اور نہایت نارمل انداز میں خفیہ طریقے سے رکھتی ہے ایسے کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی جب کہ اکثر بزرگ حضرات کا وتیرہ ہے کہ پورے شہر کو خبر کرتے ہیں۔ یار میں نے سوچا کہ تمہیں فون کر کے پوچھ لوں کہ تمہارا روزہ کیسا جا رہا ہے۔ میرا تو ٹھیک جا رہا ہے۔ ہاں ہاں کل بھی رکھا تھا۔ کسی محفل میں گئے تو...... بھئی کیا وقت ہوا ہے' روزہ لگ تو نہیں رہا لیکن......

تو قارئین میں نے تو کالم کے آغاز میں ہی عرض کر دیا تھا کہ اگرچہ لوگ کہتے ہیں کہ ان دنوں روزہ کچھ نہیں کہتا لیکن مجھے تو بہت کچھ کہتا ہے۔ اور صرف اسے بہلانے کی خاطر میں نے اس کالم کا آغاز کیا تھا اور یہ بہلتے بہلتے یہاں تک آ گیا ہے کہ کچن میں تلے جانے والے پکوڑوں کی خوشبو مجھے اپنے پاس بلاتی ہے اور بیگم بھی بلاتی ہے کہ وہاں سٹڈی میں بیٹھے کیا کر رہے ہو روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہے' پہلے واویلا مچا رکھا تھا اور اب پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے چپ بیٹھے ہو تو کیا کر رہے ہو...... آ جاؤ...... تو مجھے اجازت دیجئے۔ لیکن ایک بات کا دھیان رہے کہ اس کالم کے اختتام کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسے پڑھنے والے بھی ابھی روزہ کھول لیں۔ یہاں افطاری کا وقت ہوا چاہتا ہے آپ مقامی وقت کے مطابق اپنا روزہ افطار کیجئے گا۔

☆☆☆

"ایک برگر کے عوض ایک مسلمان بچے کی جان"

"یرقان بھائی......"

"ہاں فرقان بھائی......"

"آؤ' بچوں کی باتیں کریں......"

"بچوں کی باتیں کریں یا بچوں جیسی باتیں کریں؟"

"بھئی بچوں جیسی باتیں تو حکمران لوگ کرتے ہیں' ہم تو عوام ہیں اس لیے بچوں کی باتیں کریں۔"

"ٹھیک ہے' ہم بچوں کی باتیں کرتے ہیں' فرقان بھائی...... سب سے پہلے تو ہاتھی کے بچے کی بات کرتے ہیں جو کسی مغربی چڑیا گھر میں پیدا ہوا ہے جو صرف ایک دن کا ہے اور اس کا وزن صرف ایک سو پچپن کلوگرام کے لگ بھگ ہے۔"

"یرقان بھائی' آخر ہاتھی کا بچہ ہے' چڑیا کا بچہ تو ہے نہیں...... ایک دن کا ہے تو ایک سو پچپن کلوگرام وزن ہو گا تو تب جا کر سال بھر میں باقاعدہ ہاتھی بنے گا...... ویسے اخبار میں' میں نے بھی اس کی تصویر دیکھی تھی اور اس کے ہمراہ یہ خبر بھی پڑھی تھی کہ پیدا ہوتے ہی اس کی والدہ صاحبہ نے اسے عاق کر دیا اور اس کی دیکھ بھال کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ چڑیا گھر کی انتظامیہ نے اسے گود لے لیا۔"

"ہاتھی کے بچے کو گود لے لیا...... میاں جس نے بھی اس بچے کو گود میں لیا ہو گا تو اس کا تو کچومر نکل گیا ہو گا' ایک سو پچپن کلوگرام کے بے بی سے......"

"بھئی میں محاورہ استعمال کر رہا ہوں...... اب پتا نہیں اس کی اماں ہتھنی نے اپنے لخت جگر کو پالنے سے کیوں انکار کر دیا۔"

"شاید اس کا وزن اماں جان کی توقع سے کم نکلا ہو گا...... پہلے بے بی دو سو کلو گرام کے پیدا ہوئے ہونگے اور یہ والا ناتواں صرف ڈیڑھ سو کلو کے قریب کا تھا تو اسے سبکی محسوس ہوئی کہ اس کمبخت نے تو خاندان کی سونڈھ ہی کٹوا دی' صرف ڈیڑھ سو کلو کا نکلا...... اس لیے اماں جان نے عاق کر دیا ہو گا"۔

"ویسے ایک اور بچے کی تصویر بھی اخبار میں شائع ہوئی تھی...... ایک پاکستانی چڑیا گھر میں ایک بن مانس کے ہاں ایک برخوردار کی پیدائش ہوئی ہے...... کیا خوبصورت بن مانس کا بچہ تھا' لگتا تھا کہ اپنا ہی بچہ ہے"۔

"ہاں یرقان بھائی! شکل سے واقعی انسان کا بچہ لگتا تھا...... ویسے بھی ڈارون صاحب کے مطابق انسان سے ان بن مانسوں کی نسبت تو دور کی ہے ناں......"۔

"لیکن فرقان بھائی مجھے تو یہ نسبت بہت قریب کی لگ رہی تھی...... بہر حال بچوں کی بات چل نکلی ہے تو تم نے اخبار میں دو عقابی اُلوؤں کے بچوں کی تصویر دیکھی ہے؟"

"اُلو کے پٹھے ہوئے ناں......"

"بالکل سو فیصد خالص اُلو کے پٹھے...... ابھی پرواز کرنے کے قابل نہیں ہوئے لیکن کیا شاندار اُلو ہیں...... لگتا ہے کہ اون سے بنے ہوئے کھلونے ہیں...... ویسے یہ حقیقت ہے کہ اُلو دنیا کے خوبصورت ترین پرندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور اس کے باوجود انہیں پالا نہیں جاتا...... اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ایک تو جانے کیوں ہمارے ہاں اسے منحوس گردانا جاتا ہے جبکہ مغرب میں یہ دانائی اور حکمت کی علامت ہے...... پھر یہ گوشت خور ہے' اس کے لیے روزانہ چوہے اور چڑیاں کہاں سے لائے جائیں...... یوں بھی دن کو اونگھتا ہے اور رات کو جاگتا ہے...... فرض کرو کوئی شخص اُلو پال لے تو یار دوست جینے نہیں دیں گے کہ آپ کے گھر گئے تو وہاں اُلو بول رہے تھے یا آپ کے اُلو کے پٹھے کو دیکھا' نہایت حسین ہے یا یہ کس کو اُلو بنایا ہے وغیرہ وغیرہ...... اس سے بہتر ہے انسان پانڈا پال لے......"۔

"پانڈے سے یاد آیا کہ چین والوں نے کہا ہے کہ پانڈے اس لیے بھی کم ہو رہے ہیں کہ یہ اپنی نسل کے فروغ میں دلچسپی نہیں لیتے...... نہایت سست واقع ہوئے ہیں اور ان کی سستی دور کرنے کے لیے انہیں طرح طرح کی چینی ادویات اور کشتے کھلائے گئے تب بھی کوئی خاطر خواہ فرق نہیں پڑا اور اب انہیں قوت کی وہ سبز گولیاں کھلانے کے بارے میں غور ہو رہا ہے جو مردہ سنیاسی کو بھی زندہ کر دیتی ہیں...... ایک اور مسئلہ ہے......"۔

"اور وہ کیا ہے......؟"

"چینی پانڈا ماہرین کا کہنا ہے کہ اکثر مرد پانڈے یہ جانتے ہی نہیں کہ بے بی پانڈا بنانے کے لیے کیا عمل کرنا پڑتا ہے...... اتنے معصوم ہیں"۔

"اس کا تو ایک نہایت آسان حل ہے یا تو ان پانڈوں کو چند روز خرگوشوں کے ساتھ رکھا جائے...... خود بخود سیکھ جائیں گے یا پھر چند روز پاکستانیوں کے ساتھ قیام پذیر ہو جائیں تو وہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنوں میں آبادی کو دگنا کر دیں گے یہاں تک کہ چین میں پانڈوں کے لیے بھی فیملی پلاننگ کا محکمہ کھولنا پڑے گا"۔

"یرقان بھائی......"۔

"ہاں فرقان بھائی......"۔

"کیا ہم جانوروں اور پرندوں کے بچوں کی باتیں ہی کیے جائیں گے...... انسان کے بچوں کی بات نہیں کریں گے...... وہ بھی تو بچے ہوتے ہیں"۔

"ہوتے ہیں لیکن اتنے اہم نہیں ہوتے"۔

"خیر وہ بچے تو غرباء کے بچے تھے جو اتنے زیادہ بچے نہیں ہوتے...... ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے...... لیکن یرقان بھائی! جانوروں اور پرندوں کے بچوں کے علاوہ ان دنوں اخباروں میں ایک اور بچے کی تصویر بھی آ رہی ہے جو شکل سے تو انسان کا بچہ لگتا ہے لیکن وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے' اس کی کھوپڑی صاف نظر آ رہی ہے اور اس کے چہرے پر مکھیاں یلغار کر رہی ہیں...... اگرچہ انسان کا بچہ ہے لیکن اس کی رنگت سیاہ ہے' جبڑا کھلا ہوا ہے اور وہ بن مانس کا بچہ لگتا ہے...... لیکن ٹھہرو بن مانس کا بچہ ہوتا تو بڑا خوش نصیب ہوتا...... کسی چڑیا گھر میں فیڈر سے دودھ پی رہا ہوتا' کیلے اور پھل فروٹ کھاتا اور حیوانات کے ڈاکٹر بار بار سٹیتھو سکوپ لگا کر اس کے دل کی دھڑکن چیک کرتے...... اخباروں میں اس کی تصویریں چھپتیں اور اگر کسی وجہ سے وہ مر جاتا تو جانوروں سے محبت کرنے والوں کے بیانات آتے کہ چڑیا گھر کے انچارج کی انکوائری کی جائے اور ڈاکٹر کو گرفتار کیا جائے...... لیکن یہ جو بچہ ہے جو بن مانس کا لگتا ہے لیکن ہے انسان کا...... اگر یہ مر جائے اور یہ مر جاتا ہے تو کسی کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ انسانوں سے محبت کرنے والے کم ہو گئے ہیں......"۔

"یار یہ تم کونسے بچے کی بات کر رہے ہو؟"

"اسی بچے کی جو ایتھوپیا کی خشک سالی کا شکار ہے...... بنجر زمینوں پر منہ کھولے پڑا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو اسے ایک چیتھڑے میں لپیٹ کر ریت میں دبا دیتے ہیں لیکن اس

سے پیشتر ہم ٹیلیویژن پر دیکھتے ہیں کہ اس کی ماں بلند آواز میں سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہی ہے"۔

"اس کا مطلب ہے مسلمان بچہ ہے"۔

"ہاں...... اور وہ ایک نہیں ہزاروں بچے ہیں' مائیں سورۂ یٰسین پڑھ رہی ہیں...... جو مر چکے ہیں' ان کے پاس سینکڑوں بچے بیٹھے ہیں جن کے چہروں کو مکھیوں نے ڈھانپ رکھا ہے...... سینکڑوں بچے ہیں جو بیٹھ نہیں سکتے' اتنے کمزور ہیں کہ انہیں اگر دودھ پلانے کی کوشش کریں تو وہ پی نہیں سکتے کیونکہ وہ دودھ پینا بھول چکے ہیں...... ایتھوپیا میں ہزاروں بچے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں...... کیا تم نے کبھی کسی بچے کو...... صرف مرتے ہی نہیں تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا ہے...... اگر نہیں دیکھا تو تم جان ہی نہیں سکتے کہ اس کے ماں باپ پر کیا گزرتی ہے اور اس بچے پر کیا گزرتی ہے جس کی ماں کے پاس اسے پلانے کے لیے دودھ کی ایک بوند نہیں' روٹی کا ایک لقمہ نہیں...... اسے صرف چند آیات قرآنی یاد ہیں جو پڑھتی رہتی ہے اور وہ خوراک کا متبادل نہیں ہو سکتیں"۔

"اور یہ سب بچے مسلمان ہیں جو ان دنوں سینکڑوں کی تعداد میں ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر ایتھوپیا میں مر رہے ہیں؟"

"ہاں......"۔

"تو پھر ہمارے ہاں جو سینکڑوں مذہبی تنظیمیں ہیں' جو اسلام کے نام پر کٹ مرنے کے دعوے کرتی ہیں...... جہاد کے اعلان کرتی ہیں...... یہ کہتی ہیں کہ دنیا میں اگر کہیں بھی کسی ایک مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہے تو پوری امت کو اس کا درد ہوتا ہے تو کیا انہیں معلوم نہیں کہ ایتھوپیا میں مسلمان بچے کیڑوں' مکوڑوں کی طرح مر رہے ہیں اور اگر وہ اپنے جمع کردہ چندوں اور قربانی کی کھالوں کا ایک حصہ بھی لے کر وہاں پہنچ جائیں تو وہ بچے اور ان کے ماں باپ بچ سکتے ہیں"۔

"معلوم تو ہوگا لیکن ان کی مدد کرنے سے ان کی شان و شوکت میں اضافہ نہیں ہوتا...... کلاشنکوفوں سے لیس ہو کر اپنے ہی ہم وطنوں کو ہلاک کرنے میں تو مزہ ہی اور ہے...... اونچے عماموں اور لمبی قباؤں میں ملبوس ہو کر پریس کانفرنسیں اور اجتماع کرنے میں جو لطف ہے' وہ مسلمان بچوں کو خوراک دے کر بچانے میں تو نہیں ہوتا...... فرقان بھائی! اگر ہمارے مذہبی رہنما ایک وقت کا کھانا نہ کھائیں اور ایتھوپیا کے مسلمانوں کو بھیج دیں تو وہ بچ سکتے ہیں...... اگر ہم امیروں کے بچے امریکی ریستورانوں میں جا کر صرف ایک برگر' ایک

آئسکریم نہ کھائیں تو ان جیسے بچے موت کے منہ میں جانے سے بچ سکتے ہیں...... اگر ہم چینی ریستورانوں میں صرف ایک ڈنر نہ کھائیں تو سینکڑوں بچوں کے لیے دودھ خریدا جا سکتا ہے"۔

"فرقان بھائی! تم کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو...... بس تم ہاتھی کے بچوں کا...... پانڈوں' الوؤں اور بن مانسوں کے بچوں کا تذکرہ ہی کیا کرو...... یہ کیا انسان کے بچوں کا اور وہ بھی مسلمان بچوں کے مرنے کا قصہ لے بیٹھے ہو' اگر ان کی مائیں سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہی ہیں تو یہی کافی ہے...... یوں بھی ایتھوپیا بہت دور ہے ادھر افغانستان میں اس قسم کا کوئی سلسلہ ہوتا تو ہم جہاد کرنے پر بھی تیار تھے...... لیکن بچوں کے لیے دودھ' خوراک اور دوائیں بھیجنا اس میں شجاعت اور بہادری وغیرہ تو ہے نہیں' چاہے وہ بچے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں...... آؤ ہم مسلمانوں کے بچوں کو بھولیں اور صرف جانوروں کے بچوں کے پرلطف تذکرے کریں...... ہمارے بچے برگر اور چپس کھائیں' چینی کھانے کھائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں ان نعمتوں سے نوازا...... لیکن بہرحال ہم مسلمان ہیں اس لیے ان ہزاروں قحط سالی کا شکار بچوں کی موت پر فاتحہ تو ضرور پڑھیں گے اور اس کے بعد برگر اور چپس کھائیں گے......"۔



''کرکٹ کے کھلاڑی اور حیرت انگیز انگریزی!''

ازمنۂ قدیم میں جب ہم انگلستان سدھارے تھے تو ہمارے ایک جگری دوست پھتو شیخ نے ایک خط میں لکھا تھا کہ سنا ہے ولیت میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی فر فر انگریزی بولتے ہیں تو یار کیسے بولتے ہیں۔ تب یار نے غور کیا تو واقعی ہر بچہ انگریزی بولتا تھا۔ چنانچہ بے حد حیرت ہوئی اور یقین کیجئے آج تک یہ گتھی نہیں سلجھ سکی۔۔۔ ہم جب انگلستان گئے تھے تو اعتماد کی دولت سے مالا مال گئے تھے کہ اب ہم وہاں کے باشندوں سے انگریزی بول بول کے ان کے چھکے چھڑا دیں گے کیونکہ مشن اسکول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہم نے ''ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار'' اور ''جیک اینڈ جل'' ایسی مشکل شاعری پر پورا پورا عبور حاصل کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں گھر والوں سے چوری چھپے جو سینکڑوں انگریزی فلمیں دیکھیں تھیں ان سے تو گویا سونے پر سہاگہ وغیرہ ہو گیا تھا لیکن جب انگلستان پہنچے ہیں تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ تو کوئی اور زبان بولتے ہیں جو ہمارے پلّے نہیں پڑتی اور جو کچھ ہم بولتے ہیں وہ اُن کے پلّے نہیں پڑتا۔ ہم نے ایک ریستوران میں ویٹرس کو ہَین سینڈوچ یعنی مرغی کے سینڈوچ لانے کے لیے کہا تو وہ ہٹ ہٹ ہمارے منہ دیکھنے لگی۔ ہم نے سوچا کہ یہ یقیناً ہمارے عشق میں مبتلا ہو کر آنکھیں جھپکنا بھول گئی ہے ہم نے تھوڑی دیر تک اسے اپنے آپ کو دیکھنے دیا اور پھر آرڈر دہرایا تو وہ کمبخت ہنس کر بولی: ''اوہ یو مین چکن سینڈوچ'' سچی بات ہے ان زمانوں میں یہ ''چکن'' کا لفظ رائج نہیں ہوا تھا مرغ اور مرغی کو کاک اور ہین ہی کہا جاتا تھا چکن سے مراد چوزہ لیا جاتا تھا۔ ایک روز بس میں بیٹھے اور خاتون کنڈکٹر کو اپنی منزل کا بتا کر پوچھا کہ کتنا کرایہ ہوگا تو اس نے جواب میں ''ٹپنس ہے پنی'' قسم کا جواب دیا۔۔ دوبارہ پوچھتے

ہیں تو پھر یہی عجیب سا جواب آتا ہے۔۔ ہم نے بے چارگی سے چند سکے آگے کر دیے کہ بی بی یہ جو کچھ کہہ رہی ہو اتنا کرایہ خود ہی اٹھا لو...... اس نے ڈھائی پنس اٹھائے۔ جوان کی زبان میں ''ٹپنس ہے پنی'' بنتے تھے چنانچہ چند دنوں کے اندر اندر ہماری انگریزی کے اعتماد کا شیرازہ بکھر گیا۔

ہم نے جس پہلی بی بی کو از راہ مروت ایک کپ کافی کے لیے مدعو کیا تو اس نے کافی کے بعد رومینٹک ہو کر ہم سے کہا کہ تم مشرقی لوگ بے حد رومانوی ہوتے ہو کیا تم شاعری سے دلچسپی رکھتے ہو؟ ہم نے کہا ہاں ہاں اس میں تو ہم ید طولیٰ رکھتے ہیں اور فوراً اسے ''ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار'' سنا دی۔ قابل فہم طور پر اتنی عظیم شاعری سنتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ''تھینک یو فار دے کافی'' کہہ کر چلی گئی اور پھر کبھی نظر نہ آئی جانے کیوں حالانکہ ہم نے ابھی اُسے ''جیک اینڈ جل'' والی نظم بھی سنانی تھی۔

قصہ مختصر اہل انگلستان انگریزی کے معاملے میں بے حد پیدل نکلے اور ہمیں اپنی انگریزی فراموش کر کے دوبارہ سے ان کی واہیات انگریزی سیکھنی پڑی اور آج تک سیکھ رہے ہیں کیونکہ قابو میں ہی نہیں آتی لیکن جناب یہ گئے زمانوں کے قصے تھے جب ہم اور پھتو شیخ حیران ہوتے تھے کہ ولایت کا بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے کیونکہ اب تو پاکستان کا بچہ بچہ بھی انگریزی بولتا ہے۔۔ بے شک نزدیک ترین بچے سے بات کر کے دیکھ لیجئے۔

ہمارے جیسے بوسیدہ کمپیئر ٹیلیویژن پر آتے تھے تو کوشش کرتے تھے کہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہ کریں اور آج کل جو پرندہ کمپیئر ہیں جن کے ہاتھ ہمہ وقت پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ کہیں اردو کا کوئی لفظ منہ سے نہ نکل جائے۔ اگلے روز پاکستان ٹیلیویژن پر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خاتون میزبان ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے باقاعدہ ہمارے ساتھ یعنی ناظرین کے ساتھ فلرٹ کر رہی ہے۔ ہمیں اچھا تو بہت لگا لیکن برابر میں بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ بی بی انگلی سے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے بار بار ''ہے گائز'' کہہ رہی تھیں...... ہمیں یہ بھی اچھا لگا کہ اس عمر میں آکر ہم ''گائے'' ہو گئے ہیں۔ یہ الگ بات کہ خاتون کی ہر شے میں تناسب تھا سوائے انگریزی کے اور وہ دل کھول کر ہر قسم کی گرامر کی خلاف ورزی کر رہی تھیں۔

ہم خدانخواستہ انگریزی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس نگوڑی زبان کے بغیر ہم ادب اور فلسفہ وغیرہ کی گہرائی تک نہ پہنچ پاتے اب گہرائی تک پہنچے ہیں تو وہاں ہر

جانب تاریکی ہے تو اس کا کیا کیجئے بہر حال پاکستان میں ان دنوں انگریزی کا چلن ہے اور دیگر زبانوں کا چل چلاؤ ہے۔ اگلے روز لبرٹی مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے گئے جس شے کو ہاتھ لگاتے تھے وہ کرنٹ مارتی تھی کیونکہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ہم کچھ دیر کھڑے ہو کر ان کی باتیں سنتے رہے کہ شاید آسانی سے گفتگو مکمل کر کے نیچے آ جائیں جب نہیں آئیں تو ہم نے شاپنگ کا ارادہ ترک کیا اور ایک ریڑھی والے کے قریب کھڑے ہو کر گول گپے نوش کرنے شروع کر دیئے ہمیں ذرا سی تشویش اس وقت ہوئی جب وہ گول گپّے کے ساتھ ایک ٹشو پیپر بھی ہمیں دیتا اور کہتا "تھینک یو سر" اب دنیا کی ہر شے کی انگریزی کا ساتھ تعلق ہو سکتا ہے لیکن گول گپّوں کا نہیں۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان میں گول گپّے کی انگریزی ہی نہیں پائی جاتی بہر حال جب میں اور میرا خاندان گول گپے کھا چکے تو پوچھا بھائی جان کتنے پیسے تو اس نے انگریزی میں کچھ کہا میں نے بہروں کی طرح کان پر ہاتھ رکھ کر پھر بہ آواز بلند دریافت کیا کہ اوئے کتنے پیسے اور غور سے جواب سنا تو وہ کہہ رہا تھا "سیونٹی فائیو روپی...... سر...... تھینک یو"۔

"اوئے پانچ گول گپّوں کے کتنے پیسے؟"

"دس روپے جناب عالی"

میں نے بھنا کر کہا: "وہ تو میں تمہیں دے دوں گا لیکن پہلے پچھتّر روپے کیوں مانگ رہے تھے......"

"وہ تو میں انگریزی میں مانگ رہا تھا......"

"انگریزی میں گول گپّوں کی قیمت سات گنا ہو جاتی ہے؟"

"باؤ جی ایک تو میں نے مشکل سے انگریزی کی گنتی سیکھی ہے صرف اس لیے کہ گاہک کو انگریزی میں قیمت بتاؤں تو اس پر رعب پڑتا ہے اور فوراً ادا کر دیتا ہے بحث نہیں کرتا صرف آپ نے کی ہے...... تو آپ اردو والی قیمت ادا کر دیں ناراض کیوں ہوتے ہیں"۔

اور یہ واقعی ایک حقیقت ہے کہ انتہائی جھگڑالو خواتین بھی انگریزی میں قیمت سن کر اف تک نہیں کرتیں تاکہ دکاندار پر رعب پڑے کہ ہم انگریزی بخوبی سمجھ لیتے ہیں اور خواتین پر ہی کیا موقوف انارکلی کے ایک دکاندار سے ہم پین خریدنے جاتے ہیں تو بے شک آپ اردو میں دریافت کریں یا پنجابی میں جواب انگریزی میں دیتے ہیں اور چونکہ پڑھے لکھے ہیں اس لیے زبردست انگریزی بولتے ہیں اور ہم کان لپیٹ کر تین سو کا پین چار سو میں لے آتے ہیں کہ اب انگریزی میں بحث کون کرے......

آزادی سے پہلے کا قصہ ہے کہ ایک دیسی میم صاحب نے ٹانگے والے کو روک کر کہا: "ٹونگا والا گاڑھی شاہو کا کتنا پیسہ مانگتا ہے؟"

ٹانگے والے نے کہا: "میم صاحب پانچ روپے لوں گا"۔

اس پر میم صاحب آگ بگولا ہو کر بولیں: "ہاہائے تیرا ستیاناس ہو جائے گڑھی شاہو کا کرایہ تو آٹھ آنے ہے۔"

ٹانگے والے نے مسکرا کہا: "بی بی اگر اس طرح بات کرو تو پھر اٹھنی میں ہی چلیں گے"۔

آج جو ہم انگریزی کی طرف اپنے کالم میں التفات رکھتے ہیں تو اس کے لیے دراصل ہم پاکستانی کرکٹ ٹیم کے شکر گزار ہیں۔ جب پاکستانی کرکٹ ٹیم پہلی بار انگلستان کے دورے پر گئی تو اس میں بڑے بڑے صاحب لوگ شامل تھے اے آر کاردار، مقصود احمد، فضل محمود وغیرہ۔۔۔ ان کی انگریزی بھی اچھی تھی اور کرکٹ بھی۔۔۔ حنیف محمد، خان محمد اور محمود حسین وغیرہ کی صرف کرکٹ اچھی تھی۔۔۔ بہر حال اوول کا ٹیسٹ جیتنے اور سیریز برابر کرنے کے بعد جب ٹیم واپس آئی تو کاردار اور مقصود احمد اپنی نو بیاہتا میمیں بھی ساتھ لے آئے اور یوں پاکستانی کرکٹ میں انگریزوں کی روح حلول کر گئی۔ عمران خان جب کیپٹن کے طور پر پاکستانی کرکٹ ٹیم آسٹریلیا لے کر گئے تو حسب عادت آسٹریلین پریس اور کھلاڑیوں نے انہیں غیر مہذب اور ان پڑھ وغیرہ کے خطابات سے نوازا کیونکہ ان کا تعلق تیسری دنیا کے ایک ملک سے تھا اور وہ خیر سے جیسے بھی تھے گورا لوگ تھے۔ اس پر عمران خان نے بوتھی سجا کر بیان دیا کہ میری ٹیم کے کم از کم چار کھلاڑی آکسفورڈ اور کیمبرج سے پڑھے ہوئے ہیں باقیوں میں سے بھی بیشتر ڈگری ہولڈرز ہیں جبکہ آسٹریلوی کھلاڑیوں میں سے کسی نے آج تک آکسفورڈ یا کیمبرج کی شکل تک نہیں دیکھی اور شاید کسی مقامی کالج میں بھی داخل نہیں ہوئے تو ان پڑھ کون ہوا۔۔۔ اس پر آسٹریلوی پریس اور کھلاڑیوں نے بے حد شور مچایا تھا کہ یہ تو بد تمیز لوگ ہیں ذرا سا بھی لحاظ نہیں کرتے کھیل اور چیز ہے اور تعلیم اور چیز وغیرہ وغیرہ تو اور سنائیے کیا حال ہے...... آسٹریلیا والوں کی ذہنیت ابھی تک وہی ہے لیکن کرکٹ میں وہ چھا گئے ہیں اور بے حد بد لحاظ ہو گئے ہیں نہ کسی کو سکور کرنے دیتے ہیں نہ اپنے آپ کو آؤٹ کرنے دیتے ہیں اور نہ کوئی کیچ چھوڑتے ہیں بالکل قصاب ہو گئے ہیں۔۔۔ باکسنگ میچ میں بھی جب ایک باکسر دیکھتا ہے کہ اس کا مدمقابل ذرا بیمار شمار رہا ہے اور کمزور ہے تو وہ بھی ہاتھ ہولا رکھتا ہے تاکہ تماشائیوں کے پیسے تو پورے ہوں۔ پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ نہیں کر دیتا لیکن

آسٹریلوی کرکٹ ٹیم کو اس قسم کا کوئی خیال نہیں آتا کہ کم از کم اتنا بھرکس تو نہ نکالیں کہ دوسری ٹیمیں آیندہ ان کے ملک کا رخ ہی نہ کریں یا اپنے امپائر ساتھ لے کر آیا کریں۔ بہر حال بات ہو رہی تھی انگریزی کی تو موجودہ ٹیم میں اس حوالے سے بڑا بڑا نابغہ روزگار ہے۔ میچ کے بعد جب کمنٹیٹر ان سے سوال جواب کرتا ہے تو ان کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ وسیم بھائی تو کچھ ٹامک ٹوئیاں مار کر گزارا کر لیتے ہیں' انضمام بھائی بھی جواب نہیں دیتے سر ہلاتے رہتے ہیں۔ سعید انور بھائی نے بھی چند فقرے رٹ رکھے ہیں' اظہر محمود بھیا نے تو ایک بار صاف انکار کر دیا کہ بھئی میں تو صرف اردو بول سکتا ہوں اور یوں سرخرو ہو گئے لیکن عبدالرزاق بھائی انگریزی کے جو موتی پھرولتے ہیں وہ لاجواب ہوتے ہیں۔۔۔ نہ صرف کمنٹیٹر کو خون کے آنسو رلاتے ہیں بلکہ ناظرین کو بھی شش و پنج میں ڈال دیتے ہیں...... مثلاً......

"ہیلو رزاق ہاؤ آر یو؟"

"وسیم بھائی سَیڈ...... گو آؤٹ...... آئی گو...... اینڈ آؤٹ...... تھینک یو......"

"ویل ویل آج آپ نے زبردست پرفارمنس دی...... تو پھر آج تو پارٹی ہو گی......"

"میں وسیم بھائی پارٹی...... ٹی پارٹی گڈ' ویری گڈ ہیں جی...... تھینک یو......"

"ویل...... آیندہ میچ میں آپ کیا حکمت عملی اختیار کریں گے؟"

"وسیم بھائی سَیڈ آؤٹ...... آئی آؤٹ...... سی آؤٹ...... آل آؤٹ...... تھینک یو......"

"ڈو یو لائک آسٹریلیا؟"

"آسٹریلیا گڈ...... ویری گڈ...... بگ ویری بگ...... وسیم بھائی آلسو بگ......"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے کیپٹن کو بہت پسند کرتے ہیں؟"

"ہاں جی...... وسیم بھائی گڈ...... گڈر...... گڈیسٹ...... گڈ مین۔"

اس پر کمنٹیٹر اپنے بال نوچتا ایک کینگرو کی طرح چھلانگیں مارتا آہ و زاری کرتا غائب ہو جاتا ہے۔ ویسے ایسی "پرفارمنس" پر رزاق بھائی کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے ایک محبوب صدر بھی تو کیوبا کے صدر فڈل کاسٹرو کو فیڈرل کاسٹرو کہا کرتے تھے۔۔ انگریزی کونسی ہماری مادری زبان ہے جو کام انہیں آتا ہے وہ تو کرتے ہیں نا یعنی...... وسیم بھائی سَیڈ آؤٹ اینڈ آئی آؤٹ۔

☆☆☆

"پھُول آیا' پھُول لایا' پھُول کر میں نے کہا"

ایک تو میں پھولوں سے بہت تنگ آیا ہوں۔ اور یہ کیفیت یعنی پھولوں سے مغائرت پچھلے دو تین برس میں ہم پر طاری ہوئی ہے...... پہلے تو میں پھولوں کو بے حد پسند کرتا تھا' ذوق جمال کی بلندیوں پر فائز تھا لیکن آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا اس ذوق جمال کی بلندی سے نیچے زمین پر آ گیا ہوں۔ پھول دیکھ کر نہ صرف یہ کہ مجھے الجھن ہوتی ہے' ذرا قریب جانے پر چھینکیں آنے لگتی ہیں بلکہ میں انہیں تادیر غصے سے گھورتا رہتا ہوں...... اور سوچتا ہوں کہ اگر یہ کمبخت پھول نہ ہوتے تو زندگی کتنی خوبصورت ہوتی...... اور یاد رہے کہ میں ان پھولوں میں گوبھی کے پھول کو ہرگز شامل نہیں کر رہا کیونکہ یہ تو نہایت مفید اور عمدہ پھول ہے اور میری مرغوب غذا ہے...... میں صرف ان پھولوں کی بات کر رہا ہوں جو پھولوں کی دکانوں پر سجے ہوتے ہیں...... ٹوکریوں' گل دستوں اور گلدستے کی صورت میں اور خیر سے تحفے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں...... یعنی گلاب' ٹیوب روز' گلیڈی اولس وغیرہ وغیرہ۔

اب یہ پچھلی عید کو ہی لے لیجئے...... جو کوئی بھی عزیز رشتے دار یا دوست عید ملنے کے لیے آ رہا ہے تو ہاتھ میں ایک بُوکے یعنی گلدستے کو ایک چھتّر کی طرح تھامے ہوئے دانت نکالتا چلا آ رہا ہے...... یا گلاب کی کلیاں وغیرہ انتہائی مہنگے اور چمکیلے ریپر میں سجائے چلا آ رہا ہے...... مجال ہے کسی شریف آدمی کو مٹھائی یا کیک وغیرہ کا خیال آیا ہو...... یہ خیال آیا ہو کہ جتنی رقم سے وہ یہ ناکارہ پھول خرید رہا ہے اتنی رقم میں بُوندی کے لڈو' رسیلے رس گلے یا قلاقند وغیرہ بھی خریدے جا سکتے ہیں' چلیئے اگر ماڈرن ہونا ہے تو بھی کیک زیادہ مناسب رہے گا...... اور اس کے نتیجے میں شام تک گھر میں پھولوں کے انبار لگ گئے اور ان کی خوشبو سے

ابکائیاں سی آنے لگیں۔ اب آپس کی بات ہے کہ ہمارا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ عید کے روز مہمانوں کی تواضع کے لئے بازار سے مٹھائی وغیرہ نہیں خریدتے تھے بلکہ جو مٹھائی مہمان لاتے تھے اسی سے ان کی اور اپنی تواضع بھی کر لیتے تھے...... چنانچہ شدید نقصان یہ ہوا کہ اس روز اس کار خیر کے لئے پلّے سے مٹھائی خریدنی پڑی...... بے حد دکھ ہوا۔ علاوہ ازیں اس پھولوں کے ڈھیر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اسے کار میں ڈالا اور ان عزیزوں اور دوستوں کے گھر بھی "ہیپی عید ٹو یو" کہنے چلے گئے جن کے ہاں کبھی نہیں گئے تھے اور ہر ایک کو دانت نکالتے ہوئے یہ بُوکے وغیرہ پیش کرتے گئے...... بلکہ جو لوگ گھر نہیں تھے ان کے گیٹوں پر سے گلدستے اچھال کر چلے آئے۔ ایک اور قباحت یہ ہے کہ ان گل دستوں میں گلاب بھی ولایتی اقسام کے ہوتے ہیں اگر دیسی گلاب ہوں تو بندہ ان سے گلقند بنا کر دل اور جگر وغیرہ کو مفرح کر لے...... یوں بھی ان پھولوں کو شاید مصنوعی طریقے سے اگایا اور کھلایا جاتا ہے کہ گل دان میں سجایئے تو مرجھا جاتے ہیں اور کلیاں کھلنے کے بجائے لمحوں میں فوت ہو جاتی ہیں۔

اس بیہودہ رواج سے پہلے خوشی کے موقعوں پر صرف مٹھائی دینے کا رواج تھا' پھول ہاتھ میں ہوتے تھے تو لوگ سمجھتے تھے کہ شاید کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے یا دولہا بننے جا رہے ہیں...... مٹھائی کا اپنا ایک کلچر تھا' جی بھی خوش ہوتا تھا اور کام و دہن کی لذت بھی لطف دیتی تھی۔ میرے ایک ناشر ہوا کرتے تھے اور جب کبھی میری کسی کتاب کا نیا ایڈیشن چھاپتے تھے تو فون کر کے صرف یہ کہتے تھے کہ تارڑ صاحب مٹھائی کھلاؤ۔ ہم سمجھ جاتے تھے اور فوراً مٹھائی لے کر حاضر ہو جاتے تھے اور وہ پہلے دکان پر بیٹھے ہوئے تمام احباب کا منہ میٹھا کراتے تھے اور پھر کتاب کا نیا ایڈیشن پیش کرتے تھے...... بعض اوقات وہ کوئی واجبی سے غیر معروف مصنف کی کتاب شائع کر دیتے تو میں یہ پوچھتا کہ بھئی یہ کتاب تو یونہی سی ہے فروخت ہونے کا بھی امکان نہیں تو آپ نے کیوں چھاپ دی اور وہ اس کے جواب میں نہایت مدلل جواز پیش کرتے کہ جناب میں کیا کرتا وہ مسودے کے ہمراہ مٹھائی کا ایک ڈبہ بھی لے کر آ گئے...... تو کیسے انکار کرتا۔ یہ تھی مٹھائی کی اہمیت کہ سو روپے کی مٹھائی کے احترام میں شرفاء ہزاروں روپے ڈبو دیتے تھے۔

لاہور میں ہی پرانا فرنیچر ڈیزائن کرنے والے ایک کاریگر تھے استاد محمد علی...... اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے ہاتھوں میں ایسا کمال تھا کہ اگر ایک میز یا کرسی بناتے تو لاکھوں میں سے الگ اور منفرد نظر آتی اور اسے استعمال کرنے کی بجائے شوکیس میں سجانے کو جی

چاہتا...... میری خواہش بھی تھی کہ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی شے میرے گھر میں بھی ہو لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اگلے دس برس کے لئے 'بُک' تھے اور صاف انکار کر دیتے تھے۔ اس پر ان کے ایک مداح نے میرے کان میں کہا کہ آپ استاد کے لئے مٹھائی لے کر چلے جائیں کام ہو جائے گا۔ چنانچہ میں مٹھائی لے کر گیا تو مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا' کام بھی کر دیا اور رعایت بھی کر دی...... آج تک یاد کرتے ہیں کہ واہ جی تارڑ صاحب آپ نے کمال کر دیا بڑی عزت دی مجھے...... میرے گھر آئے تو مٹھائی لے کر آئے۔ خوشی کی کوئی خبر دینے سے پہلے یہی فرمائش ہوتی تھی کہ میاں منہ میٹھا کرواؤ...... اب آپ ہی دین ایمان سے انصاف کیجئے کہ کسی کے منہ میں لڈو کے بجائے گیندے کا پھول دیا جا سکتا ہے؟

یہ پھول دینے کی رسم قبیح یورپی عوام میں تو ایک عرصے سے رائج ہے لیکن اب برگر اور پرندہ کمپیئر خواتین کے ساتھ ہمارے ہاں بھی چلی آئی ہے...... مجھے یاد ہے کہ انگلستان میں ایک فیکٹری میں مزدوری کرنے والے ایک بھائی صاحب نے مجھے بے حد رازداری سے بتایا تھا کہ تارڑ بھائی یہ گورے بڑی سخت قوم ہیں کسی کی رعایت نہیں کرتے...... ہمارا فورمین لاکھ منت سماجت کرو تب کہیں جا کر اوور ٹائم اپنی مرضی سے لگواتا تھا۔ ہم نے سوچا اسے دیسی طریقے سے قابو کرنا چاہئے۔ لو جی ہم اس کے لیے ناں یونہی تحفے کے طور پر چاکلیٹیں' شرٹیں' بوتلیں وغیرہ لے کر جاتے تو کمبخت انکار کر دیتا کہ رشوت دیتے ہو...... ایک مرتبہ کسی کے کہنے پر فلاور شاپ سے پھول لے کر چلے گئے تو بڑی عزت کی اور اب ہمیشہ اوور ٹائم مجھے ہی دیتا ہے۔ آپ کو بھی یہاں کسی سے کوئی کام نکلوانا ہو ناں تو بس پھول لے جاؤ انشاءاللہ کام ہو جائے گا۔ ہم نے بھی اس طریقے کو آزمایا اور کارگر پایا...... اگرچہ کام اور قسم کے نکالے۔

پھر آہستہ آہستہ مٹھائی کا فیشن کم ہو گیا اور کیک آ گئے۔ یہ کسی طور مٹھائی کا نعم البدل تو نہ تھے لیکن کم از کم انہیں کھایا تو جا سکتا تھا...... البتہ کچھ دوستوں کے بچے قدرے بدتمیز ہو گئے اور جب ہم کسی موقعے پر کیک لے کر جاتے تو کہتے' انکل سادہ کیک تو اب ہمارا ڈوگی بھی پسند نہیں کرتا...... کولڈ کیک لایا جائے۔ بلیک فارسٹ بھی اچھا ہوتا ہے۔ کیک کا ایک فائدہ تھا کہ تعداد زیادہ ہو جاتی تو ہم دیگر دوستوں کے گھر جا کر پیش کر دیتے پھر کچھ ناہنجار بیکری اور ہوٹل والوں نے پیک کرتے وقت ڈبے میں گاہک کے نام کا کارڈ رکھنا شروع کر دیا تو یہ سہولت ختم ہو گئی۔

چلئے کیک تک تو خیریت رہی کہ اسے بھی مٹھائی کی طرح کھایا تو جا سکتا تھا......

اب ان کی جگہ پھولوں نے لے لی ہے...... لاہور میں جب شادی بیاہ تدفین کے موقع پر پھولوں کی حاجت محسوس ہوتی تھی تو لوہاری دروازے کے باہر جانا پڑتا تھا جہاں پھلیروں کی چند دکانیں تھیں اور وہاں یا تو دیسی گلاب اور گیندے کے ہار ملتے تھے اور یا موتیے کے گجرے اور بُندے وغیرہ...... اور اب شہر کے کسی حصے میں چلے جایئے کتابوں کی دکانیں کم ہیں اور پھولوں کی دکانیں زیادہ...... اور پھول کتابوں سے بھی مہنگے ہیں اسی لئے اب سوکھے ہوئے پھول بھی کتابوں میں نہیں ملتے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پھول دینے کا فیشن دراصل حسن جمال کے ارتقاء کا مظہر ہے اور ذوق سلیم کی نمائندگی کرتا ہے لیکن میرے دوست خلیفہ خلفشاری اس رائے سے قطعی طور پر متفق نہیں...... جب ان سے پوچھا گیا کہ خلیفہ یہ جو گلی گلی پھول بیچنے والوں کی گلی بن گئی ہے تو اس کی وجوہات بیان کرو...... کیا عوام کا ذوق نفیس ہو گیا ہے اور وہ باشعور ہو گئے ہیں...... کھانے کی چیز کا تحفہ دینے کی بجائے سونگھنے کی چیز دیتے ہیں تو وہ چمک کر بولے۔

"اس کی وجہ ایک ہی ہے میرے بھائی...... دولت اور بے شمار دولت...... ایک خاص طبقے میں روپے پیسے کی اتنی فراوانی ہو گئی ہے کہ وہ اسے خرچنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں...... بھلا ایک عام شخص جو دو وقت کی روٹی کمانے کے لئے پریشان رہتا ہے ڈھائی سو روپے میں پانچ درجن گلاب کی کلیاں خریدے گا......؟ وہ آٹے کے دو تھیلے کیوں نہیں خریدے گا۔ آپ کبھی کسی ایسے شخص کو پھولوں کا تحفہ دے کر دیکھیں اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ان کا کیا کروں...... انہیں تو اس کی گھریلو بکری بھی منہ نہیں مارتی تو فائدہ...... اس رسم کا ذوق سلیم سے نہیں ذوق فضول خرچی سے تعلق ہے۔"

پچھلی عید پر ہی میری بیٹی نے فرمائش کی کہ ابو اگر آپ صبح سویرے نماز کے بعد گلے ڈی اولس کے چند سٹے وار پھول لے آئیں تو میں انہیں گلدانوں میں سجا لوں گی...... چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر جب میں نے قبرستان جانے سے پیشتر گلاب کی پتیاں خریدیں تو پھول والے سے کہا کہ ایک درجن لمبے سٹے والے پھول بھی عنایت کر دے اور میں نے یونہی قیمت دریافت کی تو اس نے کہا کہ جی صرف تین سو ساٹھ روپے...... تیس روپے فی پھول...... آپ ساڑھے تین سو دے دیجئے گا۔ میں نے ان سے مہنگا ہونے کا گلہ کیا تو وہ کہنے لگا جناب آج سویرے دو ہزار لے کر آیا تھا ایک ہزار فروخت ہو چکے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ قیمت زیادہ ہے چنانچہ ہم کان لپیٹ کر گھر آ گئے...... اور گل دانوں سے معذرت کر لی۔

انگلستان اور یورپ میں سینٹ ویلنٹائن ڈے پر جو انہی دنوں منایا جاتا ہے ایک رسم

ہے کہ آپ اپنی من پسند خاتون کو ویلنٹائن کارڈ بھیجتے ہیں لیکن اپنا نام نہیں لکھتے تا کہ وہ اپنی عقل سلیم کو بروئے کار لا کر اندازہ لگائے یہ کون صاحب ہیں جو میری محبت میں مبتلا ہیں...... اسی طور لڑکیاں بھی اسی نوعیت کے کارڈ روانہ کرتی ہیں اور ظاہر ہے ساتھ میں پھول بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ آپ کی مقبولیت اور محبوبیت کا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے کہ آپ کو کُل کتنے کارڈ اور پھول موصول ہوئے۔ جن بے چاروں کو کوئی کارڈ نہیں ملتا وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے خود ہی بازار سے کارڈ اور پھول خریدتے ہیں اور اپنے آپ کو پوسٹ کر دیتے ہیں اور پھر دوستوں میں سرخرو ہو جاتے ہیں۔ متعدد بار ہم بھی ہوئے...... اب دو تین برس سے کیا دیکھتے ہیں کہ ماشاء اللہ اس اسلامی ملک میں بھی سینٹ ویلنٹائن ڈے منایا جا رہا ہے...... اخباروں میں اس کے حوالے سے اشتہار چھپتے ہیں اور پھول والے پھولوں کا ذخیرہ کر لیتے ہیں اور دام دگنے کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تو پھول خریدنے آتے ہی ہیں لیکن بہت سے بزرگ بھی جو دل جوان رکھتے ہیں چھپ چھپ کر آتے ہیں۔

فقیروں نے بھی اپنے طور طریقے بدل لئے ہیں۔ خواتین اپنے بچوں کو آگے لگائے ان کے ہاتھوں میں ایک ایک پھول تھمائے کاروں میں بیٹھی ہیرے جواہرات سے جگمگاتی بیگمات کی جانب دھکیل دیتی ہیں اور بچہ بیگم صاحبہ کی جانب پھول بڑھا کر کہتا ہے۔ "بی بی جی پھول لے لو......" اور بیگم صاحبہ "ہاؤ کیوٹ" کہہ کر ایک پھول کے بیس روپے ادا کر دیتی ہیں...... یہی بچہ اگر دست سوال دراز کر کے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لئے خیرات کا طالب ہو تو وہی بیگم صاحبہ اسے "دفع دور...... ہٹے کٹے ہو کام کیوں نہیں کرتے" کہہ کر دھتکار دیں گی۔

تو جناب یہ ہے پھولوں کا جادو جو آج کل سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

پھولوں نے ہمیں تو بھوکا مار دیا ہے...... نہ وہ مٹھائیاں رہیں اور نہ وہ کیک رہے...... رہے تو بس پھول رہے...... اور پھولوں کے بارے میں اگرچہ اردو ادب میں بے شمار اشعار ہیں لیکن کلاسک حیثیت صرف اس شعر نے اختیار کی ہے۔

پھول آیا پھول لایا پھول کر میں نے کہا
پھول تو تم خود ہو پھر پھول لائے کس لئے؟

یعنی کمبخت پھر پھول لے کر آ گئے ہو مٹھائی یا کیک لے کر کیوں نہیں آئے؟

☆☆☆

"چٹھی جرا سیّاں جی کے نام لکھ دے!"

پیارے قارئین میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں...... اور پلیز یہ نہ کہیئے گا کہ نیک مطلوب چاہتا ہوں گرائمر کے لحاظ سے درست نہیں...... کیونکہ جس طرح ماہ رمضان کا مہینہ ہوتا ہے اور یوم پاکستان کا دن ہوتا ہے اور شب وصل کی رات ہوتی ہے بالکل اس طور نیک مطلوب چاہتا ہوں بھی ہوتا ہے کیونکہ سچی بات ہے صرف نیک مطلوب ہے اور ماہ رمضان لکھ دینے سے تسلی نہیں ہوتی...... آپ کے نام یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ایک عرصے سے کسی کو خط نہیں لکھا...... بس یوں سمجھ لیجئے کہ خط لکھیں گے گرچہ مطلب نہ ہو والا معاملہ ہے...... باقاعدہ خط وکتابت میں سب سے پہلے تو ٹیلیفون کی آمد نے خلل ڈالا...... اس واہیات ایجاد سے پیشتر رابطے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا خط...... ٹیلیفون نے نوّے فیصد خط وکتابت کا گلا گھونٹ دیا...... اور پھر مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اب خیر سے کمپیوٹر آ گیا ہے اور ای- میل کا رواج ہو گیا ہے چنانچہ وہ جو دس فیصد خطوط نویسی چل رہی تھی وہ بھی اختتام کو پہنچ گئی۔

اسی لیے میں کسی کو خط لکھنے کے لیے ترس گیا تھا کہ پچھلے چند برسوں سے تمام دوست ورشتے دار اور دیگر محبوب قسم کے لوگ ای- میل سے پیغام بھجوا دیتے ہیں اور میں نے جو نہایت خوبصورت لیٹر پیڈ اور لفافے چھپوا رکھے ہیں وہ دھول جمع کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میری پہلی ای- میل آئی تھی تو میں بے حد پُر مسرت ہوا تھا کہ میں بھی کمپیوٹر ایج میں داخل ہو گیا ہوں۔

"ابو آپ کی ای- میل آئی ہے ذرا چیک کریں۔" میرے بیٹے نے اپنے کمرے میں سے مجھے پکارا تھا اور میں بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچا تھا۔ "کہاں ہے برخوردار...... مجھے

دے دو میں اپنی سٹڈی میں بیٹھ کر آرام سے پڑھ لوں گا۔"

"والد صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں کوئی خط تو نہیں ہے کہ آپ کو دے دوں...... ادھر کمپیوٹر کی اسکرین پر ہے نظر کی عینک لگا کر پڑھ لیں۔"

"بھئی یہ تو انگریزی میں ہے اور حرف بھی بہت باریک ہیں پڑھے نہیں جاتے......"

"ای- میل اردو میں کیسے آ سکتی ہے والد صاحب......" اس نے بھنا کر کہا......

"اچھا تو پھر تم مجھے اکیلا چھوڑ دو تاکہ میں مکمل پرائیویسی میں اسے پڑھوں...... ہو سکتا ہے کوئی ایسی بات ہو جو تمہیں نہیں پڑھنی چاہیے......"

"حد کرتے ہیں آپ بھی...... اس نے سر جھٹک کر کہا" میرے پاس "پاس ورڈ" ہے میں بعد میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔"

میں نے بڑی مشکل سے سکرین پر ناک جما کر ہر لفظ کے ہجے کرتے ہوئے ای- میل کو پڑھا...... میرا کوئی سکول فیلو تھا جو ایک مدت سے کہیں جاوا سماٹرا یا شاید جبوتی وغیرہ میں مقیم تھا...... اس نے کہیں سے میرا بلکہ میرے بچوں کا ای- میل ایڈریس حاصل کر لیا تھا اور اب پرانی دوستی کے حوالے سے مجھ سے رابطہ کر رہا تھا...... اور پرانی دوستی کے حوالے سے ہی اس نے میرے بچپن کی چند نازیبا باتیں بھی لکھ دی تھیں جنہیں پڑھتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ میرے بچوں نے بھی اسے پڑھا ہو گا......

"والد صاحب آپ فارغ ہو گئے ہیں تو میں کمرے کے اندر آ جاؤں......" میرے بیٹے نے آواز دی۔ "میں نے انٹرنیٹ پر چیٹ کرنی ہے۔"

"اب اس کمبخت نے اپنا پتا تو لکھا نہیں جواب میں خط کس پتے پر لکھوں گا۔"

"ڈیڈی......" اس کی پسرانہ محبت نے جوش مارا۔ "ای- میل کے جواب میں ای- میل ہی بھیجتے ہیں آپ جواب دینا چاہتے ہیں تو ابھی ٹائپ کر دیجئے دو تین منٹ میں پہنچ جائے گا۔"

"ہائیں...... دو تین منٹ میں...... جاوا سماٹرا یا جبوتی وغیرہ پہنچ جائے گا۔ ٹکٹ نہیں لگیں گے۔"

قصہ مختصر مجھے تو ٹائپ کی شدھ بدھ نہ تھی اور انگریزی بھی کمزور تھی اس لیے بیٹے نے میری مدد کی اور میں نے ایک شریفانہ جواب لکھوا دیا بلکہ ٹائپ کروا دیا...... ابھی فارغ نہیں ہوا تو اس کم بخت نے ایک اور پیغام بھجوا دیا کہ اوئے یاد ہے جب تمہیں حساب کے ماسٹر صاحب نے مرغا بنا دیا تھا اور جب ہم نے لائبریری سے ایک کتاب چرا لی تھی۔ میرا بیٹا

شرارت سے مسکراتا رہا اور میں نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ اسے لکھ دو کہ والد صاحب ابھی ابھی پہاڑوں میں چلے گئے ہیں سنیاس لے کر اور دو برس بعد لوٹیں گے اس لیے آئندہ رابطہ نہ کرے......

لیکن یہ تو بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ اس کے بعد تو زندگی اجیرن ہو گئی۔ لیکن سب سے بڑی ٹریجڈی تو یہی ہوئی کہ ڈاک میں خط آنے یکسر موقوف ہو گئے اور ای۔ میل کا دور شروع ہو گیا...... پرانے زمانے میں لکھتے تھے کہ اس خط کو تار سمجھنا اور اب ای میل تو دو تین منٹ میں کھٹاک سے پہنچ جاتی ہے تو اسے کیا سمجھا جائے۔ خطوط کے آؤٹ آف ڈیٹ ہونے سے زندگی کا سارا رومانس ختم ہو گیا ہے...... کیا زمانے تھے کہ چوری چھپے خوشبودار لیٹر پیڈ پر دھڑکتے دل سے خط لکھتے تھے جس پر ایک عدد بلبل کے سینے میں تیر آر پار ہوتا تھا اور دو دل بنے ہوتے تھے اور پھر اسے گیند سا بنا کہ ان کے آنگن میں پھینک دیتے تھے...... اکثر اوقات یہ گیند ان کے اباجی یا بھائی جان اٹھا لیتے تھے اور آپ کے قتل کے درپے ہو جاتے تھے۔ بہت زیادہ منصوبہ بندی کی تو کوئی کچی عمر کا نامہ بر تلاش کر لیا اسے دو میٹھی گولیاں دیکر کہا کہ یہ خط باجی کو دے دینا...... جواب لیکر آؤ گے تو دو گولیاں اور دوں گا...... یہاں بھی نامہ بر کی نادانی سے خط کہیں کا کہیں پہنچ جاتا تھا اور اگر بغرض محال ادھر سے جواب آ گیا تو خط کو ہمہ وقت تعویذ بنا کر سینے سے لگائے رکھتے تھے اور کبھی امی جان کپڑے دھونے سے پیشتر جیبوں کو الٹتی پلٹتی تھیں تو کہتی تھیں ہاہائے یہ کس چڑیل نے میرے لال کو خط لکھا ہے...... بھولی امی جان نہیں جانتی تھیں کہ دراصل ان کے لال نے چڑیل کا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ جان تم میرے خط کا جواب نہیں دو گی تو مجھے قسم ہے امی جان کی کہ میں فوراً خودکشی کر لوں گا اور تب تک خودکشی کرتا رہوں گا جب تک تم اپنی پیاری انگلیوں سے "مجھے تم سے محبت ہے" لکھ کر نہیں بھیج دیتیں۔

ای۔ میل کے رائج ہونے سے اردو شاعری کو بھی بہت ضعف پہنچا ہے...... غالب غریب کی تو لٹیا ہی ڈوب گئی ہے...... نہ نامہ بر رہے نہ کان پر قلم رکھ کر اس نیت سے نکلنے والے رہے کہ اگر اس کو کوئی خط لکھوائے تو ہم سے لکھوائے اور نہ فوت ہونے کے بعد سینے پر کھلے خط رہے...... اور نہ ہی ایڈوانس میں جواب لکھنے والے رہے جو جانتے تھے کہ وہ کیا لکھیں گے جواب میں...... البتہ ایک روشن پہلو اس ای۔ میل کا ہے کہ آپ اطمینان سے مر سکتے ہیں کیونکہ بعد مرنے کے آپ کے سامان کی تلاشی لینے پر حسینوں کے خطوط برآمد نہیں ہو سکیں گے...... بلکہ "دیوان غالب" کا پہلا مصرعہ ہی کالعدم ہو جاتا ہے کہ نقش

فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا...... اب تو کمپیوٹر ہی فریادی ہو گا اور وہ بھی ٹائپ شدہ شوخیٔ تحریر کا...... ابھی بہت دن نہیں گزرے جب معززین کے دروازوں پر لیٹر بکس آویزاں ہوا کرتے تھے اور گھر کی پہچان ہوتے تھے کہ صاحب گلی میں داخل ہوتے ہی نظر دوڑائیے گا تو سبز رنگ کے دروازے پر ایک سرخ لیٹر بکس نظر آئیگا بس وہی اس ہیچمدان کا گھر ہے...... مجھے یاد ہے کہ جب گھر لوٹتے تھے تو دھڑکتے دل کے ساتھ سب سے پہلے لیٹر بکس کی کھڑکی کی جانب دیکھتے تھے...... اگر تو وہاں خلاء ہوتا تھا تو شدید اداسی ہوتی تھی اور اگر اس میں سے کسی لفافے کا شائبہ ہوتا تھا تو دل کی دھڑکن مزید تیز ہو جاتی تھی اور طبیعت باغ باغ ہو جاتی تھی......

ہمارے ایک عزیز دوست کے صاحبزادے بہ غرض تعلیم امریکہ سدھارے تو انہوں نے بیٹے کو خاص طور پر ہدایت کی کہ میاں برخوردار خبردار وہاں سے مجھے فون نہ کرنا اور نہ ہی یہ ای۔ میل وغیرہ کی بدتمیزی کرنا...... صرف اور صرف خط لکھنا چاہے دو چار ماہ کے بعد لکھو...... میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے فون پر بات ہو جائے تو تسلی ہو جاتی ہے کہ آواز سن لی اور وہاں ہر طرح کی خیریت ہے لیکن فون کا ایکشن ری پلے نہیں ہوتا' جونہی فون بند ہوا سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا اور لگے سوچنے کہ یہ برخوردار نے جو کہا تھا کہ اباجی میں آ رہا ہوں تو یہ اگلے ماہ کہا تھا یا اگلے برس کہا تھا اور یہ جو فون کے پس منظر میں نسوانی آواز تھی یہ ریڈیو کا کوئی پروگرام ہو رہا تھا یا کوئی اور پروگرام ہو رہا تھا...... اب اگر خط آتا ہے تو اس میں بیٹے کی مہک بھی آتی ہے...... آپ اسے بار بار پڑھ سکتے ہیں پورے خاندان کو پڑھا سکتے ہیں کہ بھائی جان کا خط آیا ہے اور پھر اسے سنبھال لیتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت سند کے کام آئے...... لفافے پر ٹکٹ دیکھ کر بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ برخوردار امریکہ میں ہی مقیم ہے اور فلاں شہر میں ہے چوری چھپے کہیں اور نہیں چلا گیا۔ ٹیلیفون اور کمپیوٹر کچھ اتہ پتہ نہیں دیتے...... اور یوں بھی جذبات کا اظہار اپنی زبان میں ہی ہو سکتا ہے...... "پیارے اباجی" پڑھنے سے جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ "مائی ڈیئر فادر" میں کہاں۔

خطوں کے تذکرے سے نہ صرف شعر سجتے تھے بلکہ نثر میں بھی شفیق الرحمٰن کی "زنانہ خط و کتابت" کی بے حد ڈیمانڈ تھی۔ اس کے علاوہ "عشقیہ خط و کتابت" کا ایک بالکل الگ محکمہ تھا اور اس نوعیت کے کتابچے بے حد مقبول تھے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ڈاک خانوں کے باہر خط لکھنے والا کردار جس نے کئی افسانوں اور ڈراموں کو جنم دیا اب مفقود ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکیوں کی خاکی وردی اور پگڑی بھی متروک ہو چکی ہے اور ڈاکیے آتے ہیں تو عام روزمرہ کے لباس میں...... ان کے ہاتھ میں خط دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ

آپ کی پرائیویسی میں داخل ہو گئے ہوں...... خاکی وردی والے ڈاکیے کے ہاتھ میں ڈاک بجتی تھی۔ اور ڈاک کا تھیلا عمر عیار کی ایک ایسی زنبیل تھی جس میں سے آپ جو تمنا کرتے تھے وہی بر آمد ہو تا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم کسی شادی وغیرہ کے سلسلے میں ایک دور افتادہ گاؤں میں گئے...... وہاں ایک کچے گھر میں ہماری دور پار کی ایک رشتے دار خاتون رہتی تھیں جو خاصی عمر رسیدہ تھیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا فوج میں بھرتی ہو کر برما کے محاذ پر گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا تھا...... اگرچہ آرمی ہائی کمانڈ کی جانب سے یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ آپ کا بیٹا جنگ کے دوران لاپتا ہو گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مارا گیا ہے...... اور جنگ کے خاتمے پر اس کا ایک ساتھی افسر ان ماں جی کے پاس خاص طور پر آیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ آپ کا بیٹا میرے سامنے ایک گولے کی زد میں آکر فضا میں بکھر گیا تھا لیکن اس کے باوجود انہیں اس کی موت کا یقین نہ آیا تھا اور وہ ہر روز عین اس وقت جب ریل گاڑی سے اترنے والے لوگ گاؤں پہنچتے تو دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں وہ خط ہوتے تھے جو ان کے بیٹے نے محاذ سے لکھے تھے اور جن میں وہ اپنی ماں کو یقین دلاتا تھا کہ بس چند روز کے بعد فلاں گاڑی میں سوار ہو کر میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا...... وہ خط انہیں زندہ رکھتے تھے اور انہی کے سہارے وہ جیتی تھیں۔

چنانچہ خط صرف ایک رابطہ ہی نہیں آس اور امید کے کاغذی پرندے بھی تھے۔ اور یہ پرندے اب ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہونے کو ہیں۔ یہ ہمارے لیٹر بکسز میں جیبوں میں، مقفل دروازوں اور فائلوں میں پھڑ پھڑاتے تھے اور ہماری ڈھارس بندھی رہتی تھی کہ ہمارے پیاروں کے ہاتھوں کی تحریریں ہمارے قریب ہیں اور ہم کبھی اکیلے نہیں ہوں گے...... ان میں جو دکھ درد، محبت اور شکایتیں ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم انسان ہیں اور دوسرے انسان ہماری پرواہ کرتے ہیں۔ پیارے قارئین میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ای۔ میل کی آمد کی وجہ سے میں خط لکھنے کو ترس گیا تھا۔ آپ نے میرا یہ طویل نامہ جس صبر اور تحمل سے پڑھا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں...... یہ وہی چٹھی تھی جو ایک بانکی نار لکھواتی تھی کہ چٹھی جرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔ حال میرے دل کا تمام لکھ دے۔ چنانچہ میں نے آپ کو اپنے دل کا حال تمام لکھ دیا ہے اگرچہ میں کوئی بانکی نار نہیں لیکن قارئین آپ تو ہمارے سیاں جی ہیں...... دوبارہ تاکید ہے کہ آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں......

...... والسلام۔

☆☆☆

"زیرو بچہ سکیم کی کامیابی کی دعا!"

یورپ والوں میں خوبی یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو بولنے دیتے ہیں یعنی اظہار کی آزادی ہے...... نہ صرف اظہار کی بلکہ تقریباً ہر شے کی آزادی ہے...... آپ بے شک کتنا ہی احمقانہ نظریہ پیش کریں، آپ کو غور سے سنا جائے گا...... اگر آپ ایک لنگوٹی باندھ کر پوری زندگی ایک درخت پر گزارنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا بلکہ ٹیلی ویژن والے براہِ راست آپ کی اس زندگی کے معمولات عوام تک پہنچانے کا بندوبست کریں گے اور کوئی بھی "پاغل ای اوئے" کے نعرے بلند نہیں کرے گا...... شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنے عمل سے دوسرے لوگوں کے جذبات مجروح نہ کریں...... ہمارے ایک پاکستانی دوست انگلستان گئے اور واپسی پر انہوں نے ایک نہایت لذیذ قصہ بیان کیا...... کہنے لگے موسم سرما کی شدت سے تنگ آکر ایک روز میں نزدیکی پارک میں گیا تو وہاں ایک کونے میں کچھ زیادہ ہی شرفاء جمع تھے اور خواتین بھی ایڑھیاں اٹھا اٹھا اس جمگھٹے کے درمیان ظہور پذیر ہونے والے کسی ڈرامے کو دیکھ رہی تھیں...... میں نے سوچا شاید کوئی گشتی تھیٹر اوپن ایئر پرفارمنس دے رہا ہے چنانچہ میں نے خالصتاً لاہوری سٹائل میں دو چار شرفاء کو دھکیلا اور جگہ بناتا ہوا آگے چلا گیا، اب وہاں دیکھتا ہوں تو ایک نہایت شاندار پرفارمنس ہو رہی ہے...... پرفارم کرنے والی دو انتہائی پرکشش بدن والی خواتین ہیں اور نہایت جذب اور شوق کے عالم میں اپنے ملبوسات ایک ایک کر کے اتار رہی ہیں، معلوم ہوا کہ سردی سے تنگ آکر اتوار کی سنہری دھوپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ قدرے بیباک ہو گئی ہیں...... ان کے ہر ملبوس کے اتارے جانے پر عوام الناس تالیاں بجاتے ہیں اور دلی خوشی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ایک بڑی اماں بار بار اپنی عینک درست کرتی ہیں تا کہ کوئی گوشہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے، پُرلطف بات یہ

ہے کہ پولیس کے دو سپاہی بھی نہایت دلچسپی سے یہ سب کچھ ملاحظہ کر رہے ہیں' صرف تالیاں نہیں پیٹتے لیکن نہایت باریک بینی سے خواتین کے اوریجنل ہونے کا مشاہدہ کر رہے ہیں چنانچہ مجھے شرم تو بہت آئی لیکن کیا کرتا' ان کو بعد میں لعن طعن کرنے اور راہ راست پر چلنے کی تلقین کرنے کی خاطر کھڑا ہو گیا اور مسلسل لاحول پڑھتا رہا...... جب دونوں خواتین کے بدنوں پر چار چار گرہ کپڑا رہ گیا اور وہ اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے پر تول رہی تھیں تو اسی بڑی اماں نے جو اپنی عینک درست کرتی انہیں دیکھتی رہی تھیں' پولیس والے کی کمر میں اپنی چھتری سے کچوکا دے کر کہا: "نوجوان...... میرا نہیں خیال کہ میں ان خواتین کو یہ چار گرہ کپڑا بھی اتارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں"۔ اس پر پولیس کے نوجوان نے فوراً آگے بڑھ کر دونوں شرمیلی خواتین سے کہا: "ینگ لیڈیز! اب تک تو ٹھیک تھا لیکن اب اعتراض کر دیا گیا ہے اس لیے یہ عمل روک دیجئے"۔ چنانچہ دونوں خواتین نے قانون اور بڑی اماں کے جذبات کا احترام کیا اور نہ صرف باز آ گئیں بلکہ اتارے ہوئے ملبوسات بھی فوراً پہن لیے۔

چنانچہ آپ وہاں اپنے گھر میں یا کار میں کچھ بھی کر سکتے ہیں اور اوپن ایئر میں بھی سب کچھ کر سکتے ہیں جب تک کہ کوئی اعتراض نہ کر دے...... اس کے علاوہ آپ دنیا کی کسی بھی شے میں دلچسپی رکھتے ہوں' جانور یا نظریے میں دلچسپی رکھتے ہوں تو آپ کو کوئی نہ کوئی انجمن مل جائے گی جس کے ممبر بن کر آپ اپنے ہم نظریہ خواتین و حضرات سے تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں...... گنجوں کی انجمن' موٹوں کی' چھوٹوں کی' گلہریاں پالنے والوں کی' لمبی ناکوں والوں کی...... غرض کہ ہر طرح کی انجمن دستیاب ہے...... ایک سوسائٹی ایسی ہے جو دو چار ماہ بعد اعلان کر دیتی ہے کہ حضرات اگلے اتوار کو دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا' آخرت کی فکر کر لیجئے...... چنانچہ اس کے کئی ممبر اتوار سے پہلے پہلے اپنے گھر اور فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے دنیا کے خاتمے کا نہایت سنجیدگی سے انتظار کرنے لگتے ہیں...... سوموار کو پھر وہی گھر اور فرنیچر خرید کر ایک مرتبہ پھر آسودہ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں...... ہمارے ایک ٹیلیویژن پروڈیوسر لندن کی سیر کر رہے تھے کہ ایک عمارت پر "دنیا گول نہیں چپٹی ہے انجمن" کا بورڈ دیکھ کر اندر چلے گئے' باقاعدہ دفتر تھا' عملہ تھا اور انجمن کے صدر نہایت معقول اور پڑھے لکھے باباجی تھے...... ان کا کہنا تھا کہ دنیا ہرگز گول نہیں چپٹی ہے اور ہمارے مختلف ممبر جن میں ڈاکٹر' انجینئر اور سائنسدان بھی شامل ہیں' اس گول نظریے کو غلط ثابت کرنے کیلئے ریسرچ کر رہے ہیں جس پر ایک زر کثیر خرچ کیا جا رہا ہے...... ممبروں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہے...... ان باباجی نے انہیں انجمن کا لٹریچر اور ممبر شپ فارم بھی مہیا کیا...... لٹریچر پڑھ کر وہ

خاصی حد تک قائل ہو گئے کہ واقعی زمین گول نہیں...... ممبر اس لیے نہ بنے کہ ممبر شپ فیس دو سو پاؤنڈ تھی......

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خیر سے یورپ میں ہر طرح کی انجمنیں اور گروپ پائے جاتے ہیں لیکن ابھی پچھلے تین چار برس میں ایک ایسی انجمن وجود میں آئی ہے جس کے ممبران میں حیرت انگیز حد تک اضافہ ہو رہا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کا ممبر بن جاؤں اور اس کیلئے کام شروع کر دوں...... یہ حقیقت ہر شخص کے علم میں ہے کہ ہمارا یہ گھر' یہ زمین جس کیلئے ہم کوئی کرایہ ادا نہیں کرتے' اگرچہ اس میں رہائش پذیر ہیں' ہر نئے دن کے ساتھ بدصورت ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی بدصورتی کا آغاز اسی روز سے ہو گیا تھا جب حضرت انسان اس پر رہائش کرنے کیلئے تشریف لائے...... کچھ عرصہ تو خیریت رہی پھر آبادی میں اضافے کے باعث جو قدیم جنگل تھے' وہ کٹنے لگے...... زمینیں جو قدرت کی نیرنگیوں کی مظہر تھیں' ان پر قصبے' شہر اور صنعتی کمپلیکس ابھرنے لگے...... آسمان گم ہو گیا اور آبادیاں زیادہ ہو گئیں اور اب آلودگی اور گندگی کا یہ حال ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے...... کسی سیانے نے کہا تھا کہ کبھی آپ غور کریں تو آپ پر انکشاف ہو گا کہ زمین پر جتنی بھی گندگی اور آلودگی ہے' وہ صرف حضرت انسان کی پھیلائی ہوئی ہے...... جانور گندگی نہیں پھیلاتے' بے شک ان کے جنگل دیکھ لیجئے...... تو اس صورتحال میں ایک ایسا گروپ تشکیل دیا گیا جس کے ممبران بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کو بچانے کیلئے اور اس کا قدرتی حسن لوٹانے کیلئے نسل انسانی کا بتدریج خاتمہ ہی واحد حل ہے...... یہ نہیں کہ مہلک ہتھیاروں سے اسے ختم کر دیا جائے کیونکہ اس طرح تو پھر زمین کے چرند پرند اور جنگل متاثر ہونگے...... طریقہ یہ ہے کہ مزید بچے پیدا نہ کیے جائیں...... لوگوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول کریں اور آئندہ کوئی بچہ پیدا نہ کریں...... یوں ایک زمانہ آئے گا کہ نسل انسانی غائب ہو جائے گی اور زمین پھر سے آزاد اور خوبصورت ہو جائے گی...... گروپ کے ممبران کے خیال کے مطابق یہ نہایت ارزاں اور مؤثر طریقہ ہے' نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری...... گروپ کے ممبر بننے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ آپ کنوارے ہوں یا سرے سے آپ کے بچے ہی نہ ہوں...... بچے بے شک ہوں لیکن مزید کام بند کر دیا جائے اور جو خواتین و حضرات ابھی فارغ ہیں اور مستقبل میں شادی وغیرہ کا ارادہ رکھتے ہیں' انہیں تلقین کی جائے کہ آپ مہربانی کیجئے گا اور باز رہیئے گا...... اپنے بزرگوں کے گناہوں کا کفارہ یوں ادا کیجئے کہ زمین کو آہستہ آہستہ خالی کر دیجئے۔

میں خود پاکستان میں قدرتی حسن کے پامال ہونے...... جنگلوں کے کٹنے اور جانوروں اور پرندوں کے نابود ہونے سے بے حد رنجیدہ رہتا ہوں‘ اس لیے میں نے سوچا کہ اس گروپ کا ممبر بننے سے پیشتر ذرا پریکٹس کرلوں کہ میں اس سلسلے میں ایک اچھا تلقین شاہ ثابت ہو سکتا ہوں یا نہیں...... چنانچہ اس سلسلے کا آغاز میں نے بھولے ریڑھی والے سے کیا‘ اسے زمین کی بربادی اور قدرتی حسن کی تباہی کے بارے میں بتایا اور تازہ ترین نظریہ پیش کیا کہ بس بہت ہو چکی‘ آئندہ کیلئے بچے بند......

وہ ہنسنے لگا اور بہت دیر تک ہنستا ہی رہا اور پھر کہنے لگا: "باؤجی! یہ تو نہیں ہو سکتا......"۔

"کیوں نہیں ہو سکتا......؟"

"میری گھر والی نہیں مانے گی"۔

"تم کیسے مرد ہو کہ اسے منا بھی نہیں سکتے...... نہیں مانتی تو ذرا سختی کرو"۔

"وہ مان جائے گی تو میں نہیں مانوں گا"۔ وہ پھر ہنسنے لگا۔

"تمہارے بچے کتنے ہیں؟"

"بہت ہیں اللہ کے فضل سے......"۔

"اور تم انہیں بہت زیادہ کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں جی...... دیکھیں باؤجی آپ لوگ ذرا احتیاط سے چلتے ہیں اور دو تین بچے پیدا کر کے بس ہو جاتے ہیں‘ ان بچوں کو اچھی تعلیم دیتے ہیں‘ اچھا لباس پہناتے ہیں اور پھر سفارشیں کر کے انہیں ملازمت لے دیتے ہیں یا باہر بھیج دیتے ہیں...... لیکن ہم جو غریب آدمی ہوتے ہیں‘ ہم دس بارہ بچے پیدا کریں تب جا کر آپ کے دو کے برابر ہوتے ہیں"۔

"کیا مطلب...... دس بارہ‘ دو کے برابر کیسے ہوتے ہیں"۔

"باؤجی! پڑھائی لکھائی تو اب امیروں کے بچوں کیلئے ہے...... کسی سکول یا کالج کی فیس ہزار روپے سے کم نہیں تو ہم اپنے بچوں کو شروع سے ہی کام پر لگا دیتے ہیں...... کسی کو درزی کے پاس بٹھا دیا اور کسی کو مکینک کے سپرد کر دیا...... کسی کو اپنے ساتھ ریڑھی پر لگا لیا تو ان دس بارہ بچوں میں سے اگر تین چار لڑکیاں ہیں تو وہ گھاٹے کا سودا ہوتی ہیں...... باقی رہ گئے فرض کرو چھ لڑکے...... تو جب یہ بڑے ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک آدھ تو ہیروئن پر لگ جاتا ہے...... ایک گھر سے بھاگ جاتا ہے...... ایک دو باغی ہو جاتے ہیں اور سارا ٹیم فلمیں دیکھتے ہیں یا آوارہ گردی کرتے ہیں اور ایک پیسہ گھر نہیں دیتے...... باقی رہ گئے دو...... تو

شادی کے بعد ان میں سے ایک تو بیوی کا غلام ہو جاتا ہے اور ہمارے کام سے جاتا ہے تو باؤجی مشکل سے ایک بچتا ہے جو بڑھاپے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اب کیا پتہ اگلا بچہ وہی ہے جس نے ہمارے کام آنا ہے...... تو کیسے فل سٹاپ لگا دیں۔"

اگرچہ یہ عجیب منطق تھی لیکن کسی حد تک سمجھ میں آتی تھی...... بہرحال میں نے اسے انسان کے ہاتھوں زمین کی بربادی‘ جانوروں اور پرندوں کی کمی اور جنگلوں کی تباہی کے بارے میں پھر سے بتایا اور زور دے کر کہا کہ اسے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔

"دیکھیں باؤجی...... ہم غریب غرباء تو رزق کیلئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں...... سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے کا بھی ٹیم نہیں ملتا تو اس پر اڑتے ہوئے پرندے کہاں دیکھیں گے...... کبھی اپنے علاقے سے باہر جانے کا بھی ٹیم نہیں ہوتا...... نہ میں نے آج تک کوئی اڑتا ہوا پرندہ مارا ہے‘ نہ جانور ہلاک کیا ہے اور نہ جنگل کاٹے ہیں...... یہ تو آپ جیسے باؤ لوگ کرتے ہیں تو بچے فل سٹاپ لگانے کا کام بھی آپ کی ذمہ داری ہے‘ ہماری نہیں......"۔

تب مجھے احساس ہوا کہ یہ زیرو بچہ سکیم ہمارے ہاں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس میں ہم تیسری دنیا کے لوگوں کی بہتری بھی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر یورپ اور امریکہ والے اس سکیم پر سنجیدگی سے عمل کریں تو اگلے سو پچاس برس میں وہ سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں گے اور ہم آج سے کئی گنا زیادہ تعداد میں ہونگے اور پھر جہازوں میں بیٹھ کر ویزا کے بغیر امریکہ اور یورپ میں جا کر آباد ہو جائیں گے...... اللہ اللہ اور خیر صلّا......

☆☆☆

"میرے نام کے ریچھ کا چالان نہیں ہوگا"

میرے بہت سے دوستوں' کرم فرماؤں (یہ جو بھی ہوتے ہیں) اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے اور وہ حق بجانب ہیں کہ میرے کالموں میں انسانوں کے بجائے جانوروں' پرندوں وغیرہ کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے اور میں انسان کی عظمت کے گیت گانے کی بجائے لومڑوں اور لگڑ بگڑوں وغیرہ میں زیادہ دلچسپی لیتا ہوں اور میرے کالم کا نام "کارواں سرائے" کی بجائے "چڑیا گھر" رکھ دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا...... لیکن میں کیا کروں کہ جانوران دنوں انسان کی نسبت زیادہ دلچسپ اور خوبصورت ہو رہے ہیں...... آپ ہی انصاف کیجئے کہ حضرت انسان ایک دوسرے کے گلے کاٹنے اور فساد پھیلانے کے علاوہ کیا کر رہے ہیں...... کیا آج تک کسی اونٹ نے کسی اور اونٹ کو صرف اس لیے ہلاک کیا ہے کہ اس کا عقیدہ مختلف تھا...... یا کسی دوسرے کے گروزنی پر حملہ کر کے ٹینکوں اور توپوں سے ان کے آشیانے تباہ کیے ہیں اور ان کے بچے اور بوڑھے ہلاک کیے ہیں...... یہ کتنے ستم کی بات ہے کہ روسیوں کو ریچھ کہا جاتا ہے حالانکہ ریچھ نہایت پُرامن جانور ہے اور جب تک آپ آگے بڑھ کر زبردستی اس کے ساتھ ہم آغوش نہ ہوں' وہ آپ کو کچھ نہیں کہتا...... امریکہ صاحب بہادر اپنے آپ کو عقاب کہتا ہے جبکہ عقاب صرف اپنا پیٹ بھرنے کیلئے ایک آدھ چڑیا شکار کر لیتا ہے' پورے صحرا کو ایٹم بم سے تباہ نہیں کر دیتا اور نہ ہی نیپام بموں سے ایک پورے ملک کو جلا کر راکھ کر دینے کی کوشش کرتا ہے' ہمارے ہاں بھی کچھ حضرات اپنے آپ کو شیر کہتے ہیں اور وقت آنے پر لومڑ بن جاتے ہیں۔

دراصل کل شام میری سٹڈی میں ریچھ آگئے تھے' جی ہاں یہ بڑے بڑے بھورے ہمالیائی ریچھ جو دنیا کے بلند ترین میدان دیوسائی میں رہتے ہیں لیکن خصوصی طور پر مجھے ملنے

کے لیے لاہور آگئے تھے اور یہ رفیق راجپوت کے ہمراہ آئے تھے۔ رفیق راجپوت سے میری ملاقات تقریباً تین برس پیشتر دیوسائی میں ہوئی تھی جہاں وہ جنگلی حیات کی تنظیم کے تحت بڑے پانی کی ندی کے کنارے کیمپ لگائے ریچھوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور اس نے اپنا تعارف کچھ یوں کروایا: "تارڑ صاحب! میں کسی زمانے میں راج پوت ہوا کرتا تھا پھر سندھ وائلڈ لائف کا محکمہ جوائن کیا تو کھلی فضاؤں اور دھوپ میں رہنے کی وجہ سے راج بھوت ہو گیا"۔

"خیر آپ اتنے بھی بھوت نہیں ہیں......"۔ میں نے مارے مروت کے کہا۔
اگرچہ وہ خاصے بھوت تھے......اس کا رنگ مجھ سے بھی گیا گزرا تھا۔

رفیق راجپوت...... ریچھوں' مارخوروں' عقابوں' سنہری لومڑیوں' مچھلیوں' گرگٹوں اور چھپکلوں وغیرہ کے عشق میں فنا ہو چکا تھا' اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنی جون بدل کر ایک ریچھ یا ایک چھپکلا وغیرہ تو ضرور بن جاتا اور زیادہ خوش رہتا' جنگلی حیات کو بچانے کے جنون اور اس کی محبت میں مبتلا یہ شخص ایسا تھا کہ اسے ہر ریچھ میں ایک لیلیٰ نظر آتی تھی' ہر نادر مچھلی ایک صاحباں دکھائی دیتی تھی اور دیوسائی کی رنگین چھپکلیاں اس کے لیے سسّی یا جولیٹ سے کم نہ تھیں' وہ ان سب کے مشترکہ عشق میں مبتلا تھا لیکن اس کا پہلا عشق ریچھ تھے' وہ ان کے بارے میں باتیں کرتا تھکتا نہ تھا اور سننے والے بیزار ہو کر جمائیاں لینے لگتے تھے' لاہور میں جنگلی حیات کو بچانے کے سلسلے میں اسے ایک ایوارڈ سے نوازا گیا تھا جسے وصول کرنے کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آیا اور آتے ہی ریچھ ہو گیا یعنی ریچھوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا......

سوال کچھ بھی ہو' جواب ہمیشہ ریچھ ہوتا......

"رفیق! کیا حال ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں سر لیکن ان دنوں ریچھ اپنی سرمائی نیند میں گم دیوسائی کے غاروں میں پوشیدہ ہیں اور چونکہ وہ چھ ماہ تک سوتے رہتے ہیں اور کچھ بھی کھاتے پیتے نہیں صرف ان کی چربی پگھل کر انہیں زندہ رکھتی ہے' اس لیے بے حد کمزور ہو گئے ہونگے"۔

"بال بچے کیسے ہیں؟"

"کل چھبیس ہی تو ہیں سر......"۔

"ہائیں! تم خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہیں کرتے؟"

وہ شرما گیا۔ "نہیں جی میں تو یہ بتا رہا تھا کہ دیوسائی پر صرف چھبیس ریچھ باقی رہ

گئے ہیں' ہمارا بگ بوائے بھی اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ "سٹیمپ بوائے آف کالا پانی" جس کی تصویر ڈاک کے ٹکٹوں پر چھپی تھی' وہ بھی اب سست رہتا ہے' گرمیوں میں ملاقات ہوئی تھی' اب تو کسی غار میں سویا ہوگا"۔

"اور......زندگی کیسے گزر رہی ہے؟"

"بس جی جس روز شیطان نمبر ایک نظر آجاتا ہے تو دن اچھا گزر جاتا ہے"۔

"ہائیں تمہیں شیطان نظر آتا ہے......اور تم اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہو"۔

"ہاں جی نہایت شوخ اور چنچل ریچھ ہے' کبھی سامنے آجائے تو مسخری کرتا ہے' کرتب دکھاتا ہے اور باقاعدہ اداکاری کرتا ہے' اس لیے ہم نے اس کا نام شیطان نمبر ایک رکھا ہوا ہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ شیطان نمبر دو بھی ہوگا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ریچھوں کے جال میں آگیا تھا۔

"جی ہاں...... یہ بھی دیوسائی میں رہتا ہے' ذرا پاگل ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں کسی ایک وقت میں بہت فرینڈلی ہوگا اور پھر بہت خطرناک ہو جائے گا لیکن جناب نہایت دل پھینک اور فلرٹ قسم کا ریچھ ہے...... ریچھنیوں کو بہت تنگ کرتا ہے...... ایک "بھوت ریچھ" بھی ہے"۔

"اوہو......راج بھوت ہے؟"

"نہیں جی کالا تو نہیں براؤن ہے لیکن بہت کم نظر آتا ہے اور جب نظر آتا ہے تو یکدم کہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے' ایک اور دوست ہے جسے ہم "چالاک ریچھ" کہتے ہیں' وہ چھپ چھپ کر ہمیں دیکھتا ہے"۔

"اور تمہاری بیگم کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے مگر جولی آنٹی بہت بوڑھی ہو گئی ہیں"۔

"یہ کہیں جولی کرسٹی یا جولی رابرٹس کی رشتے دار تو نہیں؟"

"پتا نہیں جی......دیوسائی کی سب سے بوڑھی ریچھنی ہیں' تیس برس کی ہونے کو ہیں...... مجھے تو آنٹی کی صحت کی بڑی فکر رہتی ہے...... آپ بھی دعا کیجئے گا...... بہت سست ہو چکی ہیں' مجھے تو دن رات ان کا غم لگا رہتا ہے کہ کہیں کسی شکاری کے ہتھے نہ چڑھ جائیں"۔

"میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں رفیق......"۔

"تصویریں دکھاؤں سر......"۔ اس نے فوراً جیب میں سے ایک تصویری البم نکالی

اور متعدد ریچھوں اور ریچھنیوں کی تصویریں دکھائیں۔ "سردیوں میں تو دیوسائی پر برف پڑ جاتی ہے اور ریچھ سو جاتے ہیں اس لیے میری پوسٹنگ کراچی ہو جاتی ہے تو پھر ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر دن کاٹتا ہوں"۔

"اپنے بال بچوں کی تصویریں جیب میں نہیں رکھتے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "سر! وہ تو میرے پاس ہی ہوتے ہیں......یوں بھی آپ یقین مانئے کہ انسانوں کی نسبت ریچھوں کے بچے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں"۔

"دیوسائی پر میرے آنے کے بعد کوئی نیا ریچھ دستیاب نہیں ہوا؟"

"نہیں سر......! بلکہ مجھے تو بہت انتظار ہے کہ کوئی نیا ریچھ ملے اور ہم اس کا نام تارڑ ریچھ رکھیں اور شمال کے لیے اور ریچھوں کے لیے آپ کی خدمات کا اعتراف کریں......"۔

"نہیں' نہیں اس تکلف کی کیا ضرورت ہے بھئی......"۔ میں گھبرا گیا۔

"نہیں صاحب تکلف کی کیا بات ہے' دنیا کے نامور سائنسدان اور سکالر تو ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی نیا ریچھ سپاٹ کیا جائے تو اسے ان کا یا ان کی بیوی بچوں میں سے کسی ایک کا نام دیا جائے اسی لیے تو اکثر ریچھوں کے نام انگریزی ہیں......انشاء اللہ آپ اگلی بار دیوسائی آئیں گے تو وہاں ایک تارڑ ریچھ گھوم رہا ہوگا......"۔

"بھئی اگر آپ لوگوں نے مہربانی کرنی ہی ہے تو ریچھ کا نام صرف تارڑ ریچھ نہ رکھیے گا' بات کہیں اور بھی جا سکتی ہے...... میرا پورا نام رکھیے گا"۔

رفیق راجپوت پھر ہنسا اور ہنستے ہنستے بہت ہی بھوت ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"صاحب اگر ہم کسی نئے ریچھ کو مستنصر حسین تارڑ ریچھ کہیں گے تو اسے ایک فائدہ ہوگا"۔

"کیا......؟"

"اس کا چالان نہیں ہوگا......"۔ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا...... لیکن مجھے اس کی یہ ادا زیادہ پسند نہ آئی' وہ کچھ زیادہ ہی فری ہو رہا تھا۔

"بہر حال تمہاری آمد کا شکریہ...... میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتانا......"۔

"جی صاحب......"۔ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ "دو کام ہیں جن کی غرض سے میں خاص طور پر آپ کے پاس حاضر ہوا تھا......ایک تو یہ کہ آج کل اخباروں میں جہاں روس کا

تذکرہ ہوتا ہے' وہاں اسے ریچھ کہا جاتا ہے...... یہ ریچھوں کے ساتھ زیادتی ہے' آپ اخباروں میں لکھتے لکھاتے ہیں' آپ لوگوں کو بتائیے کہ ریچھ اتنے ظالم نہیں ہوتے...... کبھی جان بوجھ کر کسی پر حملہ نہیں کرتے...... میں پوری گرمیاں ان کی چراگاہوں میں گھومتا رہتا ہوں' آج تک کسی ریچھ نے مجھے گزند نہیں پہنچائی البتہ انسان بندوقیں اور کلاشنکوفیں تھامے غیر قانونی طور پر انہیں ہلاک کرتے رہتے ہیں...... اس لیے روسیوں کو ریچھ کہہ کر ریچھوں کی بے عزتی نہ کریں......"۔

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا اور دوسرا کام کیا ہے؟"

"ہندوستانیوں کو پیغام پہنچانا ہے کہ ٹھیک ہے ہمارے ساتھ تو آپ کی دشمنی ہے' ریچھوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے......"۔

"کیونکہ انہوں نے ریچھوں کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟"

"جی صاحب...... پچھلے دنوں کارگل کی جو جنگ ہوئی تھی اور آپ جانتے ہو کہ کارگل کا علاقہ دیوسائی کے ساتھ پڑتا ہے تو وہاں ہندوستانیوں کی گولا باری سے چھوٹے دیوسائی میں رہنے والا ایک ریچھ ہلاک ہو گیا تھا...... اس کے علاوہ ہندوستانی توپوں اور جہازوں کی بمباری کے دھماکوں نے ہمارے ریچھوں کو خوفزدہ کر دیا تھا کہ انسان یہ کیا کر رہا ہے' ہمیں امن سے جینے کیوں نہیں دیتا اور اس دوران بیشتر ریچھ بے حد نروس رہے اور بے چینی سے اپنے علاقوں سے نکل کر کہیں اور جا نکلے...... ہر ریچھ کا اپنا علاقہ ہوتا ہے جہاں وہ جانتا ہے کہ اس نے کہاں سونا ہے' کہاں سے مچھلی پکڑنی ہے اور کہاں گھاس چرنی ہے اور کس پتھر کے سائے میں دوپہر کو آرام کرنا ہے' اگر وہ کسی اور علاقے میں جا نکلے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے...... اچھا صاحب آپ میرے ریچھوں کے لیے دعا کیجئے گا اور میرے یہ دو کام ضرور کر دیجئے گا"۔ یہ کہہ کر رفیق چلا گیا۔

اب نہ میں روسیوں کا نام بدل سکتا ہوں اور نہ ہندوستانیوں کو سمجھا سکتا ہوں کہ کم از کم ریچھوں کو تو کچھ نہ کہیں اور انسانوں کا بھی خیال رکھیں کہ ہر انسان کا بھی اپنا ایک علاقہ ہوتا ہے' ایک وطن ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کہاں سونا ہے' کہاں سے خوراک حاصل کرنی ہے...... کس پتھر کے سائے میں آرام کرنا ہے...... تو اسے اس کا وطن دیدیں...... اس پر قبضہ قائم نہ رکھیں...... اس کا آشیانہ تباہ نہ کریں اور اس کے بچے ہلاک نہ کریں...... یہ چاہے چیچنیا ہو یا کشمیر......

☆☆☆

"ہمیں کرکٹ کے کمنٹیٹروں سے بچاؤ"

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ کرکٹ بورڈ انتہائی سنجیدگی سے کرکٹ کے چند کھلاڑیوں کو انگریزی سکھانے کیلئے خصوصی بندوبست کر رہا ہے...... یہ بندوبست کس قسم کا ہو گا' آیا انہیں نرسری کلاسوں میں داخل کروایا جائے گا یا پرائیویٹ ٹیوشن کا انتظام ہو گا' اس کے بارے میں ابھی تفصیلات طے نہیں ہو سکیں لیکن میری ناچیز رائے میں انہیں نرسری میں داخل کروانا مناسب نہیں ہو گا...... ذرا چشم تصور میں لائیے کہ میرے پسندیدہ بیٹسمین انضمام الحق اپنے گرانڈیل سراپے کے ساتھ نرسری کے بچوں میں بیٹھے ہیں اور انگلی کھڑی کر کے مس صاحبہ سے پوچھتے ہیں کہ مس پی یو ٹی...... بَٹ کیوں ہوتا ہے' بُٹ کیوں نہیں ہوتا اور پھر اپنی چھنگلی کھڑی کر کے "شی شی" کرنے کے لیے اجازت مانگتے ہیں اور اگر انہیں عمر قریشی یا اسلم اظہر سے پرائیویٹ ٹیوشن پڑھائی جائے گی تو وہ کرکٹ کھیلنے سے گئے' ساری عمر اپنا لہجہ ہی درست کرتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے یہ کرکٹ کے قومی کھلاڑیوں کے ساتھ زیادتی ہے...... انگریزی کونسی ہماری مادری زبان ہے کہ ہم اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیں...... کوئی زبان جان لینے سے انسان زیادہ عقلمند نہیں ہو جاتا اور بہتر کرکٹر تو ہرگز نہیں ہو جاتا...... ایک معروف سفارتکار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی سات زبانیں فرفر بولتے ہیں...... ایک سفارتی محفل میں جب موصوف نے بار بار اپنی اس ہفت زبانی سے دوسرے سفارتکاروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی تو ایک نوجوان سفارتکار نے سرگوشی میں کہا کہ یہ تو درست ہے کہ یہ سات زبانیں بول سکتے ہیں لیکن یہ ان میں سے کسی ایک میں بھی سوچ نہیں سکتے...... تو اصل مسئلہ سوچ ہے اور اس معاملے میں کھیل ہے...... اس مسئلے کا آسان حل وہی ہے

جس پر اظہر محمود اور انضام نے عمل کیا یعنی انہوں نے بغیر کسی شرمندگی کے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا اور کمنٹیٹر پر چھوڑ دیا کہ میاں اب تم جانو اور تمہارا کام...... جو کچھ ہم نے کہا ہے' اس کا ترجمہ انگریزی میں کرلو...... ان لوگوں کے لیے جو اس ملک میں اپنی زبان نہیں جانتے اور براؤن صاحب ہیں...... ہم لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ جی ہمارے قائدین غیر ممالک میں جاکر اپنی قومی زبان میں تقریر کیوں نہیں کرتے جب کہ دنیا کے بیشتر ممالک کے نمائندے اپنی زبان کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں اور مترجم اسے انگریزی میں ترجمہ کردیتے ہیں بلکہ چین کے چواین لائی اکثر مترجم کی ترجمہ شدہ انگریزی درست کیا کرتے تھے کہ بھائی صاحب جو کچھ میں نے چینی زبان میں کہا ہے' اس کا انگریزی مترادف یہ نہیں...... اب اگر ہمارے کھلاڑی ایسا کررہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ قابل تحسین بات ہے...... کہا جاتا ہے کہ ایک دانشور کسی معروف گلوکار کو سننے کے لیے گئے تو پہلا سوال انہوں نے یہ پوچھا کہ استاد آپ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں یا نہیں...... اس پر استاد نے کہا بھائی صاحب آپ کو مجھ سے گانا سننا ہے یا مجھ سے کچھ ٹائپ کروانا ہے......؟ تو جناب کرکٹ کے کھلاڑیوں سے آپ نے وکٹیں حاصل کروانی ہیں' سکور کروانا ہے یا ان سے ٹائپ کروانی ہے...... ویسے اس نامعقول زبان انگریزی کو بولتے ہوئے ہمارے اکثر پرانے کھلاڑیوں کے بھی چھکے چھوٹ جاتے تھے لیکن کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے اور تجربے سے انہوں نے کچھ ''ٹوں ٹاں'' کرنا سیکھ لیا...... کرکٹ کی ویکبلری یوں بھی کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتی...... آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ جی میں اچھا کھیلا...... مرلی دھرن نے میرا دھڑن تختہ نہیں کیا اور میں نے اس کی مرلی بجادی...... یا آج لڑکوں نے بہت اچھا کھیلا یا بالکل کھیلا نہیں لیکن میں پرامید ہوں کہ آئندہ میچ میں...... اور کراؤڈ نے اگرچہ کچھ گندے انڈے اور ٹماٹر ہم پر پھینکے لیکن اس نے ہمیں سپورٹ کیا اور داد دی وغیرہ وغیرہ......

پرانے کرکٹرز کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ اپنے مشتاق محمد ایک زمانے میں ٹیسٹ میچ کے دوران اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے تو ہمیشہ کہتے تھے کہ ناظرین اس وقت پاکستانی ٹیم پر پریشر کا دباؤ بہت ہے...... اگر پریشر کا دباؤ برقرار رہا تو بہت زیادہ پریشر ہو جائے گا...... اور یہ وہ بار بار کہتے تھے...... اس پر میں نے خلیفہ خلفشاری سے دریافت کیا کہ خلیفہ یہ پریشر تو ہوتا ہے لیکن پریشر کا دباؤ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ میاں جب پریشر بہت زیادہ ہو جائے تو وہ پریشر کا دباؤ ہو جاتا ہے

جیسے ماہ رمضان کا مہینہ ہو جاتا ہے۔

کرکٹ کا کھیل اب ماشاء اللہ سے پورے ملک میں ایک متعدی مرض کی طرح پھیل چکا ہے اور صرف صاحب لوگوں کا کھیل نہیں رہا۔ ایک بار کالام جاتے ہوئے میں نے دریائے سوات کے بلند کناروں پر ایک گلیشیر کے نزدیک ایک کرکٹ میچ جاری و ساری دیکھا...... ہر بال پر بیٹسمین بولر کو ہدایت کرتا تھا کہ بھئی تیز نہ کرانا کیونکہ اس کے عقب میں وکٹوں کے بجائے گہرائی میں دریا تھا اور اگر وہ بال مس کرتا تھا تو وہ سیدھی دریا میں گر کر غائب ہو جاتی تھی اور ایسا ہو رہا تھا...... وادی ہنزہ کی بلندیوں پر بھی میں نے ایسے ہی کرکٹ تماشے دیکھے...... کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب پاکستانی عوام کرکٹ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں جب کہ کرکٹ میچوں پر کمنٹری کرنے والے ہرگز یہ نہیں جانتے کہ ناظرین کی معلومات شاید اب ان سے زیادہ ہو چکی ہیں...... چنانچہ وہ اپنے پرانے' بوسیدہ اور فرسودہ انداز میں نہایت چیختی ہوئی سمع خراشی کرتی ہوئی آواز میں اچھے بھلے میچ کا ستیاناس کرتے چلے جاتے ہیں...... سری لنکا کے دورے کے دوران صرف کراچی کے میچ میں صورت حال قدرے بہتر تھی ورنہ باقی تمام میچوں کے دوران ان کمنٹری کرنے والوں نے ناظرین کو زچ کرکے رکھ دیا...... میں یہ نہیں کہوں گا کہ انہوں نے ناظرین کے صبر کا امتحان لیا کیونکہ امتحان چاہے صبر کا ہو' اسے لینے کیلئے بھی تھوڑی بہت عقل درکار ہے...... اللہ جانے ان کی کیا سفارش ہے کہ اپنی تمامتر حماقتوں کے باوجود یہ ہم پر مسلط کردیئے جاتے ہیں...... بلکہ اپنے خلیفہ خلفشاری کا خیال ہے کہ پاکستانی ٹیم کے بُری طرح ہارنے کا سبب ان کی کمنٹری تھی جو شاید کھلاڑیوں کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی...... خلیفہ کے مشورے پر ہی میں نے اپنے ٹیلیویژن کی آواز بند کردی تو ایک عجیب سکون اور سکھ کا احساس ہوا اور کرکٹ میچ پُرلطف ہو گیا...... ایک تو یہ حضرات پوری قوم کو ان پڑھ سمجھتے ہیں اور ٹیلیویژن سکرین پر نمودار ہونے والے ہر سکور بورڈ' بالنگ کے تجزیے اور تفصیل کو طوطے کی طرح پڑھنا شروع کردیتے ہیں...... انہیں کوئی نہیں بتاتا کہ اگر یہ اعداد و شمار سکرین پر آرہے ہیں تو ناظرین بھی انہیں دیکھ سکتے ہیں اور اپنی مرضی کی تفصیل دیکھ کر باقی عبارت پر نظر نہیں ڈالتے...... لیکن کمنٹری کرنے والے صاحب آپ کے دماغ پر ہتھوڑے چلاتے چلے جاتے ہیں...... چلئے یہاں تک بھی خیریت ہے لیکن انہوں نے ہر گیند کی تفصیل بہر صورت گوش گزار کرنی ہے...... کسی کھلاڑی کا کلوزاپ سکرین پر آیا تو فوراً اس کا نام

بتانا ہے کہ ناظرین یہ وسیم اکرم ہیں...... یہ معین خان ہیں...... اس کے علاوہ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ماشاء اللہ سب کے سب ہکلے ہیں...... کبھی اپنا فقرہ مکمل نہیں کرتے...... ناظرین سعید انور کا بہت ہی زوردار سٹروک...... سٹروک...... اور اس کے بعد خاموشی...... جب گیند جیسوریا روک کر اسے واپس مرلی دھرن کی جانب پھینک دیتا ہے پھر فوراً کہتے ہیں تو...... تو...... گیند...... مرلی دھرن کے پاس...... پھر ان کا مرغوب ترین فقرہ کہ نہایت شاندار سٹروک...... کوئی فیلڈر نہیں جو روک سکے اور...... اور گیند باؤنڈری لائن پار کر گئی اور چار رنز...... اس لمحے اپنے بال نوچنے کو جی چاہتا ہے کہ بھائی صاحب سکرین پر نظر آ رہا ہے کہ آس پاس کوئی فیلڈر نہیں اور گیند باؤنڈری لائن کراس کر گئی ہے اور یوں آٹھ رنز نہیں ہوتے چار ہی ہوتے ہیں تو آپ کیوں شور مچا رہے ہیں...... ہم پر رحم کریں اور ذرا گھر ہو آئیں' آپ کے بچے انتظار کر رہے ہونگے...... ذرا کسی پاکستانی کھلاڑی نے دس بیس گیندیں کھیلیں' ایک آدھ چوکا لگایا تو اس کی شان میں لگے ڈفلیاں بجانے کہ اعجاز احمد بہت بڑے بیٹسمین ہیں اور ان کے سٹائل سے لگتا ہے کہ وہ آج جارحانہ موڈ میں ہیں اور بڑا سکور کریں گے...... اور......
آؤٹ...... ایل بی ڈبلیو ہوگئے...... انہیں یہ سٹروک نہیں کھیلنا چاہیے تھا...... نہایت لاپروائی کا مظاہرہ کیا اعجاز احمد نے...... ابھی ہم کمنٹیٹر کو بھگت رہے ہوتے ہیں تو کوئی پرانے کھلاڑی ایکسپرٹ کے طور پر وارد ہو جاتے ہیں...... اکثر اوقات یہ ایک ایسے کھلاڑی ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے پورے کیریئر میں اتنی وکٹیں نہیں لی ہوتیں جتنی وقار یونس نے کسی ایک سیریز میں حاصل کی ہوتی ہیں لیکن وہ فوری طور پر وقار یونس کو مشورے دینے شروع کر دیتے ہیں...... انہیں چاہیے کہ بیٹسمین کو یار کر دیں ابھی آؤٹ ہو جائے گا...... گیند کو ذرا ہوا میں سوئنگ کرائیں تو بہتر ہوگا وغیرہ وغیرہ...... شاید اس ہولناک کمنٹری کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بیشتر حضرات ریڈیو کے زمانے کے ہیں اور اب بھی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں' یہاں تک کہ گیند کا رنگ بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی فرماتے چلے جاتے ہیں کہ ناظرین گیند جا رہی ہے' جا رہی ہے...... اور...... اور......
میرا خیال ہے کہ ان حضرات کی بھی تطہیر ہونی چاہیے...... اگر سیاستدانوں اور بیوروکریسی کی تطہیر ہو سکتی ہے تو کمنٹیٹر حضرات کی بھی ہو سکتی ہے...... بلکہ انہیں ریٹائر کر کے یکسر نئے اور قدرے شگفتہ مزاج لوگ سامنے لائے جائیں بلکہ اس شعبے کیلئے بہت زیادہ ٹیکنیکل لوگوں سے پرہیز کیا جائے اور خوش مزاج اور زندہ دل کمنٹیٹر بھرتی کیے

جائیں...... یہ جیسے بھی ہونگے' موجودہ حضرات سے زیادہ بورنگ اور بے ہودہ نہیں ہو سکتے...... مجھے یہاں شارجہ کپ کے دوران کمنٹری کرنے والے وہ صاحب یاد آ رہے ہیں جن کا نام شاید ٹونی ہے...... وہ صرف کھیل کے بارے میں ہی نہیں بلکہ کھیل دیکھنے والوں کے بارے میں بھی نہایت دلچسپ اور پرمزاح کمنٹری کرتے تھے...... کھیل بے جان ہوتا تب بھی ان کی شگفتہ مزاجی اس میں جان ڈال دیتی۔
یلدرم نے دہائی دی تھی کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ لیکن پاکستانی شائقین فریاد کرتے ہیں کہ ہماری کرکٹ کو موجودہ کمنٹیٹر سے بچاؤ...... اگر ایسا نہ کیا گیا تو یقین کیجیے پریشر کا دباؤ بڑھ جائے گا۔



"کلنٹن ہاتھی پر کیوں سوار نہیں ہوئے!"

پیارے قارئین آپ تو اس امر سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ میں ایک انتہائی اعلیٰ پائے کا دانشور اور فلسفی شخص ہوں اور دن رات زندگی اور رموز کائنات کے بارے میں غوروخوض کرتا رہتا ہوں چنانچہ اس غوروفکر کے دوران کبھی کبھار کوئی ایسا مسئلہ ذہن میں آجاتا ہے جس کی گتھی لاکھ سلجھانے سے بھی نہیں سلجھتی اور میں بے حد پریشان ہو جاتا ہوں اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جب بھی کوئی اس قسم کی صورت حال درپیش ہوتی ہے تو میں ہمیشہ خلیفہ خلفشاری سے رجوع کرتا ہوں۔ چنانچہ اب کی بار خلیفہ میرے ہاں نہیں آئے میں ان کے ہاں چلا گیا۔

"خلیفہ......" میں نے علامہ اقبالؒ کی مانند ایک مٹھی کنپٹی سے لگا کر فلسفیانہ انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ "بہت دنوں سے ایک نہایت عمیق اور فلسفیانہ نکتہ مجھ سے حل نہیں ہو رہا۔ نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور مجھے اس کا جواب نہیں مل رہا"۔

"کہو کیا پوچھنا چاہتے ہو"۔ خلیفہ نے بھی فلسفیانہ انداز اختیار کر لیا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ بل کلنٹن ہاتھی پر کیوں نہیں بیٹھا؟"

"ہائیں"۔ خلیفہ کا منہ کھل گیا۔ "یہ مسئلہ ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے...... ہندوستان کے دورے کے دوران راجستھان میں جب کلنٹن صاحب کو ہاتھیوں نے سلامی دی اور پھر انہیں ان میں سے صرف ایک ہاتھی پر بیٹھنے کی پیشکش کی گئی تو موصوف نے انکار کر دیا...... کیوں؟"

"بھئی عجیب گھامڑ ہو۔ یہ کوئی سوال ہے پوچھنے کا۔"

"یہ بہت اہم سوال ہے خلیفہ۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کلنٹن صاحب ہاتھی پر

کیوں سوار نہیں ہوئے تو مجھے امریکی خارجہ پالیسی سمجھ میں آجائے گی۔ ویت نام کی جنگ، سرد جنگ، عراق پر پابندیاں اور ان کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے لاکھوں بچوں اور سی ٹی بی ٹی کی سمجھ میں آجائے گی۔ خدا کیلئے مجھے یہ بتا دو کہ کلنٹن ہاتھی پر کیوں نہیں بیٹھا تھا"۔

"اسے ہاتھیوں سے ڈر لگتا ہے"۔

"نہیں خلیفہ۔ دنیا کا سب سے طاقتور شخص ہاتھیوں سے کیسے ڈر سکتا ہے"۔

"ایک تو تم بے حد جاہل شخص ہو۔ امریکی سیاست کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے"۔

"میں تو پاکستانی سیاست کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں رکھتا"۔

"پاکستانی سیاست کی خیر ہے اس کا علم تو ہمارے سیاستدان بھی نہیں رکھتے لیکن پاکستان کی بقاء اور سلامتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم امریکی سیاست کا علم رکھیں۔ تو بھئی وہاں دو بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ڈیموکریٹس اور ری پبلکن۔ ان دونوں کے اپنے اپنے نشان ہیں۔ ڈیموکریٹس کا امتیازی نشان گدھا ہے"۔

"یعنی کھوتا؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پارٹی الیکشن کے دوران یہ نعرے لگا رہی ہو کہ گدھے کو ووٹ دیں یا ساڈھا کھوتا آوے ای آوے"۔

"بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں ہمیں سمجھ نہیں آسکتیں۔ یوں بھی امریکہ میں گدھوں کی بھی عزت ہوتی ہے۔ انہیں تقریباً انسانوں کے برابر ہی سمجھا جاتا ہے البتہ نیگروز کو نہیں سمجھا جاتا تو یہ جو بل کلنٹن ہیں یہ ڈیموکریٹ ہیں اور ان کا امتیازی نشان گدھا ہے"۔

"خلیفہ یہ کیا بے ہودہ بکواس کر رہے ہو۔ آہستہ بولو۔ کسی نے سن لیا تو امریکی امداد بند ہو جائے گی۔ ان کے صدر کے بارے میں میں اس قسم کی واہی تباہی بکتے ہو"۔

"تم یہ جاننا چاہتے ہو ناں کہ کلنٹن صاحب ہاتھی پر کیوں نہیں بیٹھے؟" خلیفہ غصے میں آگئے۔

"اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔ تم بولو۔ اب میں نہیں بولوں گا"۔

"تو کلنٹن کی مخالف پارٹی جو ری پبلکن ہے اس کا امتیازی نشان ہاتھی ہے۔ اب اگر کلنٹن ہاتھی پر بیٹھ جاتے تو ان کی بے عزتی ہو جاتی کہ مخالف پارٹی کے جانور پر جا بیٹھے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اجتناب کیا"۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہندوستانی بھی امریکی سیاست سے ناواقف ہیں۔ انہیں

گدھا پیش کرنا چاہیے تھا"۔

"ویسے ابھی ابھی کلنٹن کے ہاتھی پر نہ بیٹھنے کی ایک اور وجہ میرے ذہن میں آئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاہان سلف میں شاید نادر شاہ تھے جنھوں نے ہاتھی پر سوار ہونے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ جس جانور کی باگ میرے ہاتھ میں نہ ہو میں اس پر سواری نہیں کر سکتا"۔

"ہاں خلیفہ یہ وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ جس شخص کے ہاتھ میں پوری دنیا کی باگ ہو وہ بھلا باگ کے بغیر رہ سکتا ہے۔ ویسے خلیفہ کلنٹن صاحب کو ہم نے بہت منت سماجت کر کے پاکستان بلایا ہے تو ہمیں ان کا زبردست استقبال کرنا چاہیے۔ ہندوستانیوں کا جانور ہاتھی ہے تو ہمارا اسلامی جانور اونٹ ہے۔ ہم انہیں اونٹ پر بٹھا دیں گے"۔

"نہیں نہیں وہ اونٹ پر بھی نہیں بیٹھیں گے"۔

"کیوں...... اونٹ تو امریکہ کی کسی سیاسی جماعت کا امتیازی نشان نہیں ہے"۔

"نہیں وہ اونٹ سے الرجک ہیں"۔

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ اسامہ بن لادن بھی اونٹ پر بیٹھا کرتا تھا"۔

"ہم وہی اونٹ تھوڑا ہی لائیں گے جس پر اسامہ سوار ہوتا تھا۔ کوئی اور اونٹ لے آئیں گے"۔

"سبھی اونٹوں کی خصلت ایک جیسی ہوتی ہے۔ سخت کینہ پرور ہوتے ہیں اس لیے رسک نہیں لیا جاسکتا۔ شیر پریوں بھی ان دنوں پابندی ہے اور شیر پر بیٹھنا مشکل ہے اس لیے کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا"۔

"خلیفہ...... اگرچہ کلنٹن صاحب دورے پر تو نہیں آرہے۔ پل دو پل کے لیے ایئرپورٹ پر سانس لینے کے لیے رکیں گے لیکن ہمیں ان کا ایسا استقبال کرنا چاہیے کہ اس کے سامنے ہندوستانیوں کا استقبال ماند پڑ جائے۔ کیا خیال ہے"۔

"بھئی ہم ہندوستانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تاج محل کہاں سے لائیں گے"۔

"ہم انہیں موٹروے دکھا دیں گے"۔

"چیلسی کو ہولی کہاں کھلائیں گے؟"

"ہم اس کو نہاری کھلائیں گے اور ساتھ میں لسّی پلائیں گے"۔

"اور بھائی ہمارے پاس اتنے ہاتھی بھی نہیں سلامی دینے کیلئے"۔

"لو...... یہ جو اتنے ڈھیر سارے سرکاری محکموں کے ہاتھی ہیں یہ کس دن کام آئیں گے۔ ویسے بھی اونٹ ہی بہتر رہیں گے"۔

"یار ہاتھی تو سونڈھ اٹھا کر سلامی دیتے ہیں۔ اونٹ کیا کریں گے؟"

"وہ اپنے پورے دانت نکال کر کہیں گے۔ ہائے بل......"

"چلو یہاں تک کا بندوبست تو مناسب ہے لیکن ہندوستان میں راجے مہاراجے ان کی خدمت میں پیش ہوئے تھے ان کی برابری کیسے کریں گے؟"

"خلیفہ ہندوستان میں تو راجوں مہاراجوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے محلات کو ہوٹلوں میں بدل رہے ہیں اور حکومت کو درخواستیں پیش کرتے رہتے ہیں سرکار۔ ہمارا وظیفہ بڑھایا جائے گزارا نہیں ہوتا بلکہ ایک رانی صاحبہ نے تو احتجاج کے طور پر دلی ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں زندگی گزار دی۔ لیکن ہمارے ہاں صورت حال نہایت شاندار ہے۔ ہندوستانی راجے اور نواب تو دو نمبر ہیں کیونکہ وہ پشت ہا پشت سے چلے آتے ہیں اور کیا پتہ اصلی بھی ہیں کہ نہیں جب کہ ہمارے راجے اور نواب ہماری آنکھوں کے سامنے بنے ہیں۔ سرے محل اور رائے ونڈ پیلس کیا جے پور کے محلات سے کم ہیں۔ ہمارے وڈیرے سائیں ایسی حویلیوں میں رہتے ہیں جو مہاراجوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ اس لیے ہم انہی مقامی راجوں اور نوابوں کو کلنٹن صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں گے"۔

"یہ مشورہ ہے تو مناسب لیکن آج کل اس رائلٹی کے بیشتر افراد نیب کے مہمان ہیں اور ان کے ذمے جو کروڑوں ڈالر واجب ہیں ان کی بازیابی کی کوششیں ہو رہی ہیں"۔

"بھئی ملک کی عزت اور آبرو کیلئے اگر یہ ایک دن کی ضمانت پر جیل سے باہر آجائیں۔ کلنٹن صاحب کو آداب بجالائیں جو وہ خوشی سے بجالائیں گے تو کیا حرج ہے"۔

"چلو اس کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں کلنٹن صاحب کے گرد گھیرا ڈال کر جو راجستھانی خواتین رقص کر رہی تھیں اور کلنٹن میاں بھی ہاتھ اٹھائے ٹھمکے لگا رہے تھے اس کے مقابلے میں ہم کیا کریں گے"۔

"کمال ہے ہم ہر شے میں کفار کی پیروی تو نہیں کر سکتے۔ ہماری اپنی تہذیب اور روایات ہیں جنہیں ہم کلنٹن کیلئے قربان تو نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری خواتین بھنگڑا ڈالتی ہوئی کلنٹن کا استقبال کریں۔ آخر قومی غیرت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے"۔

"ہوتی ہوگی...... لیکن کلنٹن صاحب کو خوش بھی تو کرنا ہے۔ ناراض کر کے تو گھر نہیں بھیجنا۔ کہیں وہائٹ ہاؤس پہنچتے ہی ہماری امداد موقوف نہ کر دیں۔ قرضے ری شیڈیول

کرنے سے انکار کردیں۔ پھر کیا کریں گے۔ کھائیں گے کہاں سے؟"

"ہاں یہ چھوٹی سی اڑچن تو ہے۔ پیٹ کے لیے تھوڑی سی قومی غیرت کو قربان کر دینا کسی حد تک جائز ہے۔ تو اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ وادیٔ کیلاش کی خواتین کو اسلام آباد لے آیا جائے وہ بھی کفار میں شامل ہیں اس لیے رقص وغیرہ کو معیوب نہیں گردانتیں۔ وہ کلنٹن صاحب کا استقبال کرلیں یوں ہم رند کے رند رہیں گے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے گی"۔

"بھئی تم تو واقعی نہایت اعلیٰ پائے کے دانشور ہو۔ میں تمہاری محبّ الوطنی اور ذہانت کا قائل ہو گیا ہوں۔ یہ مشورے اگر تاخیر سے ارباب اختیار تک پہنچے تو کوئی مضائقہ نہیں آئندہ بیس تیس برس بعد جب کوئی امریکی صدر پھر پورے پانچ گھنٹوں کیلئے پاکستان آئے گا تو یہی شاندار منصوبہ بندی کام آجائے گی"۔

"ویسے خلیفہ...... اب لگے ہاتھوں یہ بتادو کہ صدر کلنٹن کے اس دورے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے"۔

"بھئی ہمارا مستقبل تابناک ہو جائے گا۔ کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سی ٹی بی ٹی کا قضیہ طے ہو جائے گا۔ پاکستان خوشحال ہو جائے گا اور ہم سب چین کی بنسری بجائیں گے۔ لیکن اس کا دارومدار صرف اس بات پر ہوگا کہ ہم چیلسی کے ساتھ ہولی کھیلیں اور کلنٹن صاحب کو اونٹ پر بٹھادیں"۔

☆☆☆

"ایک گھونٹ پانی مٹھّی بھر گندم"

خواتین و حضرات میں فقیر ہونا چاہتا ہوں اور یقین کیجیے میں مذاق نہیں کر رہا، مزاح تخلیق کرنے کی کوشش نہیں کر رہا...... میں بے شک ایک فقیر کی طرح ہی اندھا ہو جاؤں، اگر میری اس خواہش میں ذرا سی بھی غیر سنجیدگی ہو...... اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں فقیر بننے کے طور طریقوں سے آگاہ نہیں ہوں...... اس کا پروسیس کیا ہے، اس کے بارے میں قطعی طور پر لاعلم ہوں۔ میں اس بات سے تو آگاہ ہوں کہ ہمارے اکثر وزرائے خزانہ امریکہ کے سامنے کیسے فقیر ہوتے ہیں، کیسے کشکول توڑے جاتے ہیں اور پھر جھولی پھیلا دی جاتی ہے، مشاعروں میں کچھ شعراء کیسے داد کی بھیک مانگتے ہیں، مصائب کے مارے ہوئے کیسے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں...... حسن کی بھیک مانگنے والے پیشہ ور عاشقوں کو بھی میں جانتا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ انسان اگر سچ مچ فقیر بننا چاہے تو اس کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟

کسی کے لیے فقیر ہو جانا بھی چنداں دشوار نہیں لیکن میں تو چوراہے میں کھڑے ہو کر "اللہ ہی دے گا اور کر بھلا سو ہو بھلا" کی آوازیں لگانا اور ہاتھ پھیلانا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں آپ کی مدد کا طلبگار ہوں۔

ہمارا جو بچپن تھا، ان دنوں تین شعراء نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے اور یہ ہرگز ضروری نہیں تھا کہ آپ ان کے دیوان پڑھ کر ہی ان کے اشعار سے لطف اندوز ہوں بلکہ بے شمار نوجوانوں کو ان کا کلام زبانی یاد تھا...... یہ شعراء ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی اور عدم ہوا کرتے تھے...... ساحر کی تلخیاں، اختر کی سلمیٰ اور عدم کی "خرابات" ہر ایک کی زبان پر تھے تو ان زمانوں میں عدم کی ایک غزل بے حد مشہور ہوتی تھی کہ پھول دامن میں چند رکھ لیجیے،

راستے میں فقیر ہوتے ہیں...... اور پھر وہ۔۔۔ جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں' آدمی بے نظیر ہوتے ہیں...... ادائل جوانی میں کبھی بھی ہ سمجھ نہ آئی کہ ایک شخص پھٹے پرانے لبادے میں کشکول لیے بھیک مانگتا پھرتا ہے تو وہ بے نظیر آدمی کیسے ہو سکتا ہے...... پھر بی بی بے نظیر کے آنے پر صورتحال مزید الجھ گئی کہ وہ بھلا آدمی کیسے ہو گئیں...... چنانچہ اب کئی برسوں کے بعد جب یہ شعر یاد آیا ہے تو اس سے بھی نیچ مچ کا فقیر بننے کیلئے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔

اپنے چچا غالب کی طرف رجوع کیا تو وہ بھی کہنے لگے کہ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب' تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں لیکن میں صرف فقیروں کا بھیس نہیں بنانا چاہتا واقعی فقیر ہونا چاہتا ہوں...... کیونکہ جب سے پاکستان تخلیق ہوا ہے' پوری قوم نے یہ بھیس بنا رکھا ہے اور اہل کرم کے در پر پڑی ہے' یہاں تک کہ یہ یاد بھی نہیں رہا کہ ہم کب فقیر نہیں تھے...... یوں بھی اگر صرف بھیس ہی بنانا ہوتا تو ٹیلیویژن سے سرسری وابستگی کی بناء پر میں اپنے واقف کار میک اپ آرٹسٹ سے یہ درخواست کر سکتا تھا کہ مجھے فقیر بنا دو اور پھر وارڈروب سے ایک کشکول اور ایک گدڑی حاصل کر کے ایسا فقیر بن سکتا تھا کہ آئی ایم ایف والوں کو بھی چنداں شبہ نہ ہوتا اور وہ مجھے مالا مال کر دیتے لیکن میں ڈرامہ نہیں کرنا چاہتا' کم از کم اس بار نہیں کرنا چاہتا' ان زمانوں میں جب اداکاری بھی چلتی تھی' میں نے چند ڈراموں میں فقیروں اور گداگروں کے کردار بھی ادا کیے اور یقین جانیئے کہ میں بہت زبردست فقیر بنا کرتا تھا...... شاید میری شکل ہی ایسی تھی کہ میک اپ مین کو زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس کے ساتھ جب ہاتھ میں کشکول لیے' گلے میں مالائیں پہنے' ننگے پاؤں ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے لاہور کی سڑکوں پر "اللہ ہی دے گا" کی دلدوز صدائیں بلند کرتا تھا تو عوام الناس تو کیا عام قسم کے دو نمبر فقیر بھی مجھ سے متاثر ہو کر بھیک دے دیتے تھے' ڈرامے کی ریکارڈنگ کے بعد اس مصنوعی فقیری سے جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا' اس سے ٹیلیویژن کا عملہ دوپہر کی روٹی کھایا کرتا تھا لیکن میں یہ نہیں کر سکتا...... ڈرامہ اور بہت سارے لوگ بھی کر رہے ہیں تو پھر ان میں اور مجھ میں کیا فرق رہ گیا...... میں واقعی گداگر بننا چاہتا ہوں۔

فقیری سے مجھے ہمیشہ صادقین یاد آ جاتے ہیں' ان کے ساتھ ایک عرصہ دوستی رہی' قربت رہی اور جب کبھی ملاقات ہوتی اور بے شک صبح ہوتی اور پھر شام کو آمنا سامنا ہو جاتا تو بھی اس فقرے سے خوش آمدید کہتے کہ قبلہ تارڑ صاحب یہ بندۂ فقیر حقیر پُر تقصیر ایک مدت سے آپ کی راہ دیکھ رہا ہے' کہاں تھے......؟ اور یہ حقیقت ہے کہ دنیاوی آسائشیں ان پر قطعی طور پر اثر نہیں کرتی تھیں...... ان کے بارے میں قطعی طور پر لاپرواہ تھے......

کھانا پینا اور رہائش ہمیشہ معمولی رکھتے...... لباس میں بھی لاپروائی غالب تھی حالانکہ ان کی ایک ایک تصویر لاکھوں میں بکتی تھی لیکن میں ان کی طرح کا فقیر بھی نہیں ہو سکتا...... ایک مرتبہ مشرق وسطیٰ میں ایک نمائش کے دوران کسی ارب پتی شیخ کو ان کی ایک خطاطی پسند آ گئی جس پر "برائے فروخت نہیں" کی چٹ آویزاں تھی...... شیخ صاحب نے بلینک چیک صادقین کے سامنے رکھ دیا کہ جو رقم چاہیں اس میں بھر لیں اور صادقین اس قسم کی صورت حال سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے کہنے لگے۔ "قبلہ شیخ صاحب اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ برائے فروخت نہیں ہے' چاہے آپ اپنی پوری ریاست کی آفر لگا دیں"۔ شیخ صاحب نے منت سماجت کی' سفارشیں کروائیں لیکن صادقین کا ایک ہی جواب کہ یہ برائے فروخت نہیں...... آخر کار جب شیخ صاحب مایوس ہو کر جانے لگے تو صادقین نے خطاطی اتار کر انہیں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمارے فن کو خرید نہیں سکتے...... آپ شیخ ہیں تو ہم فقیر ہیں تو اس فقیر کی جانب سے یہ تحفہ قبول کر لیجیے...... آپ بھی کیا یاد کریں گے"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے یہ خطاطی بغیر قیمت لیے بخش دی...... وہ تو اس قسم کے فقیر تھے...... ہمیں بھی اپنے فن پارے یونہی بخش دیا کرتے تھے چنانچہ میں ان جیسا فقیر بھی نہیں بن سکتا۔

میں اس لیے بھی فقیر نہیں بننا چاہتا کہ ان دنوں دن رات محنت کر کے رزق حلال کمانے والوں کی نسبت فقیر زیادہ خوشحال ہیں کیونکہ جوں جوں معاشرے میں ناجائز دولت کے انبار لگتے ہیں توں توں لوگ اپنے ان گناہوں کی بخشش کے لیے نیکی اور پارسائی کمانے کے لیے زیادہ خیرات کرتے ہیں...... لاہور کے اکثر چوراہوں پر' ٹریفک سگنل پر جو فقیر کھڑے ہوتے ہیں' ان پر کاروں اور بڑی جیپوں میں سے نوٹوں کی جو بارش ہوتی ہے' وہ مجھ ایسے مڈل کلاس شخص کو بھی للچا دیتی ہے...... ہم اپنے ایک ایک روپے کے سکے گنتے رہتے ہیں اور ان کاروں میں سے ہیرے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ اور سگار تھامے ہوئی انگلیاں باہر آتی ہیں اور دس کے نوٹ کو ردی کے ایک کاغذ کی طرح پھینکتی ہیں...... دن میں سینکڑوں روپوں کی یہ بے دریغ خیرات ان کے ضمیر کے لیے مرہم کا کام دیتی ہے...... اگرچہ یہی لوگ ایک گملے کے ٹوٹ جانے پر اپنے مالی کی تنخواہ میں سے پانچ روپے کاٹ لیتے ہیں' برتن صاف کرنے والی مائی سے کوئی پلیٹ ٹوٹ جائے تو گالیوں کے علاوہ نصف ماہ کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے کہ انگلش سیٹ کی پلیٹ تھی۔

اگلے روز بھولا ریڑھی والا بھی یہی شکایت کر رہا تھا کہ باؤ جی میں منہ اندھیرے اُٹھ کر منڈی میں جاتا ہوں' مال خریدتا ہوں اور پھر سارا دن دھوپ میں کھڑے ہو کر آوازیں لگا لگا

کر پاگل ہو جاتا ہوں تو بھی سوڈیڑھ سو سے زیادہ کی دیہاڑی نہیں بنتی اور یہ بڑی بڑی سڑکوں پر کھڑے فقیر چند گھنٹوں میں مجھ سے کہیں زیادہ کما لیتے ہیں...... لوگ غریبوں کی مدد نہیں کرتے' فقیروں کی کرتے ہیں...... ظاہر ہے میں اس قسم کا فقیر بھی نہیں بننا چاہتا۔

آپ اب تک یقیناً میری اس فقیر بننے کی رٹ سے عاجز آ چکے ہوں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ میں جو معاشرے کا ایک معزز فرد ہوں' یکدم کیوں فقیر بننا چاہتا ہوں...... تو میں آپ کو بتاتا ہوں...... میں ان لوگوں کے لیے فقیر بننا چاہتا ہوں جو خود آپ تک نہیں آ سکتے...... جو چولستان میں' تھر میں اور بلوچستان میں پیاس سے مر رہے ہیں...... بھوک سے ہلاک ہو رہے ہیں...... اپنے گھر اور گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آ کر اپنے مردہ بچوں کی نمائش کر کے آپ سے بھیک نہیں مانگ سکتے...... جن کے مویشیوں کے ڈھانچے خشک قحط زدہ زمینوں پر بکھرے ہوئے ہیں...... جتنے پانی سے آپ کی پجارو دھوئی جاتی ہے' آپ کے کتے نہلائے جاتے ہیں' اتنے پانی سے ایک پورے گاؤں کے سوکھتے ہوئے حلق تر ہو سکتے ہیں اور ان کے نیم مردہ بدن زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں...... میں نے پچھلے دنوں ایتھوپیا کے قحط زدہ بچوں کے بارے میں لکھا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ بھوک اور پیاس اور مرگ کا یہ عذاب میرے اپنے وطن پر بھی نازل ہو جائے گا...... ظاہر ہے اس عذاب کے نزول کے بارے میں نہ کوئی سرکاری محکمہ جانتا تھا اور نہ حکومت کو علم تھا ورنہ اس کا سدباب کر لیا جاتا...... یا تو آپ میری بات کا اعتبار کر لیجیے کہ میں ذہنی اور جذباتی طور پر فقیر بن چکا ہوں اور اگر آپ اعتبار نہیں کرتے تو صرف آپ کو یقین دلانے کے لیے میں میک اپ کر لیتا ہوں...... ہاتھ میں کشکول تھام کر آپ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں اور آپ سے تھر کے لیے' چولستان کیلئے' بلوچستان کے لیے...... وہاں کی اجڑتی بستیوں اور سوکھتے بچوں کے لیے ایک گھونٹ پانی اور مٹھی بھر گندم کی بھیک مانگتا ہوں...... اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن نعمتوں سے نوازا ہے' ان میں ان بھوک سے مرتے ہوئے' پیاس سے بلکتے ہوئے پاکستانیوں کا بھی کچھ حصہ ہے...... میں عبدالستار ایدھی جیسا عظیم انسان نہیں ہو سکتا جو ایسے موقعوں پر جھولی پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں...... میں تو صرف لفظوں کا کشکول آپ کے سامنے پھیلا سکتا ہوں...... فقیر بن سکتا ہوں...... میں زندگی میں پہلی بار سچ مچ کا فقیر بنا ہوں' میری لاج رکھ لیجیے گا اور میرے پاکستان کے لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ میری جھولی میں ضرور ڈالیے گا...... شکریہ!

☆☆☆

"بچوں کو مزاحیہ شاعر نہ دکھائیے!"

ان دنوں ہر طرف مزاحیہ شاعری کا چلن ہے...... اس لیے کہ ہر طرف پیسے کا چلن ہے اور پیسہ صرف مزاحیہ شاعری سے ملتا ہے' یہاں تک کہ ہمارے بہت سے نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ پائے کے شاعر بھی مزاحیہ ہو گئے ہیں اور اس مزاحیہ ہونے کی کوشش میں عزت سادات بھی گئی' یوں بھی عوام الناس اس محبوب سے تنگ آ چکے ہیں جس کا فل ٹائم مشغلہ عاشق پر جور و ستم کے پہاڑ ڈھانا ہے' بے وفائی ایسا شعار ہے کہ جو میر کے زمانے سے شروع کیا ہے تو ان زمانوں تک چلا آتا ہے...... ڈھول دھپا بھی کرتا ہے تو عاشق یہی کہتا ہے کہ یہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں' یونہی غلط فہمی میں چند جھانپڑ جڑ دیے ہیں اور یہ روایتی محبوب ایسا ہے کہ ہمیشہ سے رقیب کے پہلو میں ہی بیٹھا رہتا ہے اور شاعر کو بزم ناز سے اٹھاتا ہی رہتا ہے' چنانچہ عوام الناس آہیں بھرتے بھرتے اور ٹک رو کر سوتے سوتے تنگ آ گئے ہیں اور اب اگر مشاعرے میں جاتے ہیں تو صرف مزاحیہ شاعروں کو سننے...... مزاحیہ شاعروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے اور یہ خوبی انہیں خدا نے دی ہے یا مزاحیہ شعر پڑھتے پڑھتے ان پر اثر ہو گیا ہے کہ ان کی شکلیں بھی مزاحیہ ہوتی ہیں اور ہر مصرعے کے بعد دانت نکال کر اپنے تیئں ایک مزاح پرور چہرہ بناتے ہیں اور سامعین کی طرف دیکھتے ہیں چنانچہ اگر شعر مزاحیہ نہ ہو تو بھی ان کے لیے ہنسنے کا وافر سامان ہوتا ہے...... البتہ بچہ لوگ ان کی ایسی شکلیں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں کہ ابا مجھے گھر لے چلو' یہ بھوباٹا جو سامنے بیٹھا ہے' یہ مجھے کھا جائے گا۔

ہمارے بچپن میں رومانوی شاعری کا چلن تھا اور مزاحیہ شاعری کو گھاس نہیں ڈالی جاتی تھی...... اب اتنی زیادہ ڈالی جاتی ہے کہ مزاحیہ شاعر کے پیٹ میں اپھارا اٹھنے لگتا

ہے...... ان دنوں حاجی لق لق' مجید لاہوری' احمق پھپھوندوی' راجہ مہدی علی خان اور امام دین گجراتی اس صنف میں شہرت رکھتے تھے...... بزرگوں میں اکبر الہ آبادی کا سکہ چلتا تھا لیکن ان سکہ بند شاعروں کے باوجود مزاحیہ شاعری کو وہ عروج حاصل نہیں ہوا تھا جو ان دنوں اس کے نصیب میں ہے...... سکول کے زمانے میں تو سب سے مزاحیہ شعر یہی سمجھا جاتا تھا کہ کھڑکیوں کے کھڑکنے سے کھڑکتا ہے کھڑک سنگھ...... اور کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں...... اس کا جو بھی مطلب تھا' ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے...... اُن دنوں یوں بھی ہنسنے ہنسانے کے مواقع کم ملتے تھے کیونکہ ابھی پاپ سنگر میدان میں نہیں آئے تھے۔ پچھلے دنوں یونہی خیال آیا کہ مزاحیہ شاعری سے اتنی بے اعتنائی بھی اچھی نہیں کیوں نہ سنجیدگی سے اس کا جائزہ لیا جائے اور وہ بزرگ جو تھوڑے سے مسخرے تھے' ان کے کلام سے حظ اٹھایا جائے...... چنانچہ اس صنف میں باقاعدہ تحقیق کی گئی تو کھلا کہ ہمارے بزرگ مزاحیہ' شاعری کے میدان میں جو کمالات دکھا گئے ہیں' موجودہ نسل تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی شاید اس لیے کہ بزرگ مشاعرے کے لفافے کے لیے مزاحیہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ شعلہ' قہقہہ باران کے اندر سے اٹھتا تھا...... اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے گئے' ان کی ایک جھلک پیش خدمت ہے مثلاً احمق پھپھوندوی کا کہنا ہے اور حضرت احمق اگر کچھ بھی نہ کہیں تو ان کا نام ہی مسکرانے کیلئے کافی ہے تو وہ کہتے ہیں

نئی حد بندیاں ہونے کو ہیں آئین گلشن میں
کہو بلبل سے اب انڈے نہ رکھے آشیانے میں

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں بھی آئین میں ترمیم ہوا کرتی تھی۔ ایک محترم بزرگ تھے' پھل آگروی نام کے...... مجھے ان سے ملاقات کا شرف متعدد بار حاصل ہوا' اول اول شاعری کی جانب رخ کیا تو تخلص کچھ اور کرتے تھے پھر احباب نے مشورہ دیا کہ عام شاعروں کے تخلص کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے' آپ بڑے شاعر ہیں اس لیے ایسا تخلص اختیار کیجئے جو معنی کا ایک سمندر ہو اور بھاری بھرکم ہو چنانچہ تجویز کیا گیا کہ آئندہ سے پھل کہلایا کیجئے' اس میں ورائٹی بہت ہے...... انہوں نے بخوشی یہ تجویز قبول فرمائی...... مجھے یاد ہے کہ ایک بار کڑکتی گرمیوں میں ان کے ساتھ ایک دوپہر منائی گئی کیونکہ شام تو ہر کسی کے ساتھ منائی جاتی ہے...... جب استاد تشریف لائے تو ان کے گلے میں پھلوں کا ہار ڈالا گیا جس میں متعدد خربوزے اور ایک تربوز پیر دیا گیا تھا...... خاص انتظام یہ کیا گیا کہ سامعین کی

کرسیاں چھاؤں میں تھیں اور اکیلے استاد کو سامنے دھوپ میں بٹھایا گیا اور استاد دل شکنی کے موجب نہ ہوئے بیٹھ گئے...... اب تو مرحوم ہو چکے...... ایسے نابغہ لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں...... نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

میرے شعر سن کر سبھی کھل اٹھے ہیں
مزا آ رہا ہے لطیفے کی صورت
میں پھل ہوں مجھے جانتا ہے زمانہ
کہ ہے شکل میری شریفے کی صورت

اسی قبیل کے ایک شاعر بیدل جونپوری کا لازوال کلام بھی پیش خدمت ہے۔

تھا وہ چپراسی مگر دیکھا تو افسر سا لگا
رشوتوں کا مال اس کو شیر مادر سا لگا
اس کا بھدا سا بدن میک اپ میں مرمر سا لگا
غازہ اس کثرت سے تھوپا تھا پلستر سا لگا
کل نئی بیگم جو شاپنگ کیلئے گھر سے چلے
شوہر بے چارہ ان کے ساتھ شوفر سا لگا

حاجی لق لق کے نام سے کون واقف نہیں لیکن افسوس کہ ان کا کلام ناپید ہوتا جا رہا ہے...... باقاعدہ شاعر تھے لیکن مزاح بھی کمال کا لکھتے تھے۔

کیا ان کو حال دل سنانے سے فائدہ
ہو گا تو ہو گا نوٹ دکھانے سے فائدہ
اب بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ میرے بزرگ ہو
کچھ بھی ہوا نہ شیو کرانے سے فائدہ

دلاور فگار کو ہم سے رخصت ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری' مزاح سے بھرپور شعر پڑھنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا' پڑھتے ہوئے خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور سامعین کو بھی دنیاوی رنج والم سے آزاد کر دیتے تھے۔

نہ مرا مکان ہی بدلا ہے' نہ ترا پتا کوئی اور ہے
مری راہ پھر بھی ہے مختلف ترا راستہ کوئی اور ہے
یہ جو تیتر اور چکور ہیں وہی پکڑیں ان کو جو چور ہیں
میں چکور اکور کا کیا کروں مری فاختہ کوئی اور ہے

راجہ مہدی علی خان بنیادی طور پر سنجیدہ شاعر تھے اور ایک زمانے میں بمبئی کی فلم انڈسٹری میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا' لتا منگیشکر اور محمد رفیع ان کے گیتوں کے اسیر تھے...... مولانا ظفر علی خان کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور مزاح میں بھی کمال رکھتے تھے...... اردو میں ٹھیٹھ پنجابی کی ملاوٹ سے سماں باندھ دیتے تھے مثلاً

کیوں بجھاتے ہو دیا الفت کا پھوکاں مار کے
چاہتا ہے دل مرا رووواں میں کوکاں مار کے

یا پھر......

منجی دا پاوا اماں میٹھوں نہیں ہے ٹٹیا
کل اس پر اللہ رکھا تشریف رکھ گیا تھا
وہ آئے تھے گھر میں سویرے سویرے
رہے مجھ سے لیکن پریرے پریرے

اس شاعری کو انہوں نے "پنجاب کے دیہات میں اردو" کے نام سے پیش کیا۔

موجودہ عہد میں اگر کسی شخص کو مزاحیہ شاعری میں ملک الشعراء کا خطاب دیا جا سکتا ہے تو وہ بلاشبہ ضمیر جعفری تھے' نثر اور شاعری میں جو کمال ان کو حاصل تھا' وہ کسی اور کے نصیب میں نہ آیا' تقریباً تیس برس پیشتر انہوں نے مجھے اپنی کتاب "جزیروں کے گیت" سے نوازا اور ان میں جو نغمگی اور حلاوت تھی' رومان اور جدائی کی جو کسک تھی' وہ تڑپا کے رکھ دیتی تھی' ان کی اپنی والدہ کے بارے میں جو نظم ہے' اس کی مثال اردو میں کم کم ملتی ہے...... میں ہمیشہ ان سے عرض کرتا کہ مرشد کبھی جزیروں کی جانب بھی لوٹ آیئے اور وہ کہتے کہ بھئی کیا کروں' مشاعرے میں جاتا ہوں تو لوگ فرمائش ہی مزاحیہ کلام کی کرتے ہیں ورنہ میں اندر سے جزیروں میں ہی آباد رہنا چاہتا ہوں...... وہ ہم سے جدا ہوئے تو گویا واقع اپنی پسند کے جزیرے میں چلے گئے۔

اک ذرا افسر نے مونچھیں چھوڑ دیں
محکمہ سارا مچھندر ہو گیا
اس کی اردو میں تھی انگریزی بہت
لوگ یہ سمجھے کمشنر ہو گیا
جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیر
اب تو اک عرصے سے شوہر ہو گیا

یہ حقیقت ہے اور میں ہرگز مبالغہ نہیں کر رہا کہ مزاحیہ شاعری میں جو اساتذہ ہو گزرے ہیں وہ صورت شکل میں انتہائی سنجیدہ ہوتے تھے اور ان کا کلام ہنساتا تھا جبکہ موجودہ شعراء یعنی مزاحیہ شعراء کی شکلیں مزاحیہ ہوتی ہیں اور اگر کلام نہ ہنسائے تو ان کی شکل کام آ جاتی ہے...... کہا جاتا ہے کہ بہاولپور کے ایک مشاعرے میں ایک شاعرہ نے اپنے معاوضے پر شدید احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے فلاں شاعرہ سے کم ادائیگی کیوں کی گئی ہے جب کہ میں اس نگوڑی کی نسبت کہیں زیادہ خوبصورت ہوں...... شاید اسی قسم کا فارمولا مزاحیہ شاعروں میں بھی برتا جاتا ہوگا کہ جناب فلاں شاعر کو تو اتنی رقم ملی ہے جبکہ میری شکل اس سے کہیں مزاحیہ ہے...... بہرحال جب اساتذہ کا تذکرہ ہو تو سید محمد جعفری بھی اوج کمال پر نظر آتے ہیں...... بعض شعراء کی مانند ان کا کلام اٹک اٹک کر نہیں چلتا بلکہ ایک ندی کی طرح رواں ہوتا ہے۔

کھڑے ہیں میز کنارے ایک پلیٹ لیے
انہی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
اِدھر اُدھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے
کھڑا تھا پیچھے سو میں رہ گیا پلیٹ لیے
یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

شوکت تھانوی اگرچہ اپنی مزاحیہ نثر کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں لیکن وہ ایک پُر بہار شاعر بھی تھے اور کمال کے شاعر تھے۔

لوگو مجھے سلام کرو' میں وزیر ہوں
گردن کیساتھ خود بھی جھکو' میں وزیر ہوں
تم ہاتھوں ہاتھ لو مجھے دورے پر آؤں جب
موٹر کے ساتھ ساتھ چلو' میں وزیر ہوں
مجھ سے قرابتوں کو بس اب بھول جاؤ تم
اے میرے بھائی بند گدھو میں وزیر ہوں
مجھ کو تو مل گئی ہے وزارت کی زندگی
مرتے ہو تم تو جاؤ مرو' میں وزیر ہوں

اور ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ اپنے "لختِ جگر" سے کیا فرمائش کر رہے ہیں۔

اے مرے بچے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو
یاد رکھ پچھتائے گا مرے گھر پیدا نہ ہو
ہم نے یہ مانا کہ پیدا ہو گیا' کھائے گا کیا
گھر میں دانے ہی نہیں پائے گا تو بھنوائے گا کیا
اس نکھٹو باپ سے مانگے گا کیا' پائے گا کیا
دیکھ کہنا مان لے جانِ پدر پیدا نہ ہو
اے مرے بچے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

اب ظریف جبلپوری کی ظرافت کے چند نمونے دیکھئے۔

راہ وفا میں عشق کا ٹٹو
اڑ جاتا ہے چلتے چلتے
عشق کی گرمی توبہ توبہ
تھک گئے پنکھا جھلتے جھلتے

اور......

محبت ہم کو روحانی غذا معلوم ہوتی ہے
میاں ناصح کو لیکن سنکھیا معلوم ہوتی ہے
دبا کر میری چاچی نے چچا کو اس طرح رکھا
چچی معلوم ہوتا ہے چچا معلوم ہوتی ہے

محمد طٰہٰ خان ایک درویش صفت بزرگ ہیں اور مزاحیہ شاعری کے حوالے سے خانِ اعظم کہلانے کے حقدار ہیں اس لیے بھی کہ کبھی اپنا حق نہیں جتاتے' گوشے میں پشاور کے انہیں آرام بہت ہے...... آنکھوں کی روشنی کھو جانے کے باوجود مسرت کی روشنی لوگوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں' ان کا قطعہ ہے "اسپتال" ذرا دیکھئے۔

کہیں دس بیس بیٹھے ہیں کہیں دو چار بیٹھے ہیں
عجب شانِ ہلاکت سے یہاں بیمار بیٹھے ہیں
سبب اس کا جو پوچھا ڈاکٹر صاحب نے فرمایا
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

"سیاست" کے حوالے سے کہتے ہیں۔

میرے محبوب محبت سے سیاست میں نہ آ
بدسگالی کو یہاں حسنِ عمل کہتے ہیں
ہم پس پشت دیا کرتے ہیں جن کو گالی
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

عنایت علی خان بھی اپنے مزاج کے شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ اپنے مزاج کے شاعر ہیں۔

کہا تھا دوستی اتنوں سے مت کر
بوقت عقد پھڈا ہو گیا نا!
سیاسی کم نگاہی رنگ لائی
ہمیں پھر مارشل لاء ہو گیا نا!
یہ میرا دیدۂ تر روتے روتے
منسپلٹی کا نلکا ہو گیا نا!
کنکھیوں سے بہت تکتا تھا اس کو
وہ آخر کار بھینگا ہو گیا نا!

مزاحیہ شاعری پر ایک نظر ڈالیں تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ جن دو شعراء نے مزاح میں ایسے رنگ جمائے کہ آج کے شاعر انہی رنگوں میں قلم ڈبو کر ان کے طرزِ فغاں سے خوشہ چینی کرتے ہوئے دال دلیا کرتے ہیں' انہیں وہ شہرت اور عزت حاصل نہ ہوئی جس کے وہ حقدار تھے...... یعنی بابا عبیر ابوذری اور استاد امام دین گجراتی...... آج بے شمار شاعر انہی کے رنگ میں لیکن ان سے پھیکے شعر کہتے ہیں اور ملک الشعراء کہلاتے ہیں۔ ایک بار فیصل آباد میں ابوذری نے تقریباً 45 منٹ کی ایک نظم سنائی کہ زبانی سنا رہے تھے اور اس نظم کا ہر شعر کمال کا تھا...... ان کے شعر میں مزاح کے زیرِ سایہ جو رنج کی پرچھائیں تھیں' وہ انہیں بڑا شاعر بناتی تھیں

بہت دبلی پتلی حیاتی ہوتی جاتی ہے
چپاتی رفتہ رفتہ کاغذاتی ہوتی جاتی ہے
وہ لندن میں مکیں ہیں اور میں ہوں چیچو کی ملیاں میں
ہماری دوستی قلمی دواتی ہوتی جاتی ہے

ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں افسر اعلیٰ
تبھی تو آج اپنی چوڑی چھاتی ہوتی جاتی ہے

اورذرا عشق کے امتحاں ملاحظہ کیجئے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
پرے سے پرے پراں اور بھی ہیں
ابھی تو تجھے ایک چھینٹی لگی ہے
ابھی تو ترے امتحاں اور بھی ہیں
وہ کھڑکی نہیں کھولتی تو نہ کھولے
نظر میں مرے یاریاں اور بھی ہیں
عیرا تجھے وہ بھی سہنا پڑیں گی
مقدر میں جو سختیاں اور بھی ہیں

ان کی ایک ”غزل“ نے تو مسلسل تہلکا مچائے رکھا۔ ٹیلیویژن پر اس کے بیشتر شعر سنسر کی زد میں آجاتے اور میری پسندیدہ غزلوں میں سے ایک ہے۔

رویا ہوں تری یاد میں دن رات مسلسل
ایسے کبھی ہوتی نہیں برسات مسلسل
کانٹے کی طرح ہوں میں رقیبوں کی نظر میں
رہتے ہیں مری گھات میں چھ سات مسلسل
چہرے کو نئے ڈھب سے سجاتے ہیں وہ ہر روز
بنتے ہیں مری موت کے آلات مسلسل
ہر روز کسی شہر میں ہوتے ہیں دھماکے
رہتی ہے مرے دیس میں شب رات مسلسل
ہر روز وہ ملتے ہیں نئے روپ میں مجھ کو
پڑتے ہیں مری صحت پر اثرات مسلسل
پیتے نہیں ، بنتی ہے ، تو پھر جاتی کہاں ہے
یہ ذہن میں اٹھتے ہیں سوالات مسلسل
امراء کے موافق ہے فضا دیس مرے کی
کٹتے ہیں جہاں عیش میں لمحات مسلسل

بہت عرصے پہلے کا قصہ ہے' ایک صاحب ایک معروف شاعر کے بارے میں کچھ سطریں لکھوانا چاہتے تھے کہ وہ ان کے بارے میں ایک خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ رکھتے تھے...... میں نے معذرت کی کہ نثر کا آدمی ہوں' شاعری کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتی اور خاص طور ان شاعر کی تو بالکل سمجھ میں نہیں آتی...... وہ صاحب کہنے لگے چلیے ٹھیک ہے لیکن نعت انہوں نے بہت کمال کی لکھی ہے...... میں نے عرض کیا کہ استاد امام دین اس حوالے سے ان سے کہیں بڑے ہیں...... اس بیان پر وہ صاحب باقاعدہ خفا ہوگئے کہ آپ ایک بین الاقوامی شہرت کے شاعر کی بے عزتی کررہے ہیں' کہاں وہ اور کہاں امام دین...... اس پر میں نے انہیں استاد کا وہ شعر سنایا جو انہیں نعت میں ایک بلند مقام پر فائز کرتا ہے۔

نبیؐ کا جس جگہ پہ آستاں ہے
زمین کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

وہ صاحب سناٹے میں آگئے اور کہنے لگے واقعی استاد امام دین کا شعر ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ ”بانگ دہل“ دیکھ لیجئے چنانچہ امام دین کے ہاں ان کی لیاقت کی وجہ سے نہ سہی قدرت کی جانب سے کچھ نہ کچھ عطا ہو جاتا ہے...... آج کے بیشتر مزاحیہ شاعر انہی کی پیروی کررہے ہیں...... ذرا اس غزل کو دیکھئے کہ کیا رنگ ہیں۔

اچھلتا ہے بانسوں جگر مام دینا
کہ جب سے لڑی ہے نظر مام دینا
کسی نے یہ ماری ہے مٹر مام دینا
کہ گھر میں پکے ہیں مٹر مام دینا
دبانا دبانا میری پنڈلیوں کو
کہ ان میں ہے سوز جگر مام دینا
کمیٹی سے کہہ دو کہ چھڑکاؤ کر دے
کہ آئے گا وہ میرے گھر مام دینا
کوئی سیٹ جنت میں خالی نہیں ہے
تو جلدی سے دوزخ میں وڑ مام دینا

☆☆☆

"یار وزن کم نہیں ہوتا"

جب آپ کسی چوپٹ کھلے دروازے میں سے بھی سینہ تان کر نہیں ذرا پہلو بدل کر داخل ہوں......

جب آپ ایستادہ حالت میں نیچے دیکھیں تو آپ کو اپنے جوتے نظر نہ آئیں......

جب آپ کسی بوفے ڈنر کی میز کے قریب جائیں تو بقیہ مہمانوں کے رنگ زرد ہو جائیں۔

پارک میں سیر کرتے ہوئے ان باباجی کے پاس جائیں جو وزن کی مشین سامنے رکھے وزن کرانے والوں کے منتظر ہوں اور وہ آپ کو دیکھ کر کہیں "باؤجی مشین خراب ہے"۔

آپ کے دوست مسکرا کر کہیں کہ ماشاءاللہ آپ کی صحت تو ان دنوں بہت اچھی جا رہی ہے......

اور آپ جھک کر کیاری میں کھلے پھول کو سونگھنے سے گریز کریں......

اور جب آپ اندرون شہر جائیں اور وہاں پر ہر دوسرا شخص آپ کو "آؤ پہلوان" کہہ کر مخاطب کرے تو جان لیجئے کہ آپ قدرے فربہ ہو چکے ہیں......اور اگر آپ کے بچے آپ کو لاڈ سے "موٹو ابو" کہنے لگیں تو پھر بھی جان لیجئے کہ آپ بہت ہی فربہ ہو چکے ہیں اور اگر آپ نوجوانی کی منزلوں میں ہیں اور پیار کرتے ہوئے والدہ محترمہ کی گود میں بیٹھ جاتے ہیں اور جب اٹھتے ہیں تو والدہ کو لخلخہ سنگھا کر بحال کرنا پڑتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ پانی واقعی سر سے گزر گیا ہے......

میں بہ ذات خود ان دنوں اسی "پوزیشن" میں ہوں اور سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسا

کیوں ہو رہا ہے...... باقاعدگی سے سیر بھی کرتا ہوں...... ناشتے پر پراٹھا بھی ایک ہی کھاتا ہوں...... انڈے بھی خاصے کم کر دیئے ہیں...... گیارہ بجے کے قریب جب بھوک بہت ہی پریشان کرتی ہے تو چائے کے ساتھ پورا ایک بھی نہیں کھاتا...... نہاری اور سری پائے وغیرہ وغیرہ بھی ہر روز نہیں کھاتا' ایک دن ناغہ کرتا ہوں...... برفی کا استعمال تو بہت ہی کم کر دیا ہے...... تازہ مکھن پر چینی چھڑک کر چمچے سے کھائے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا ہے......

البتہ کھیر اور حلوہ صرف اس لیے شوق سے کھاتا ہوں کہ کہیں نارواپرہیز سے بدن میں شوگر کی کمی واقع نہ ہو جائے۔ اتنی احتیاطوں کے باوجود کچھ پلے نہیں پڑتا کہ میں اس "پوزیشن" میں کیوں ہوں...... اس کا احساس تو مجھے اسی روز ہو گیا تھا جب ایک شادی پر جاتے ہوئے میری بیگم نے مجھے ڈانٹا کہ نیلے شلوار قمیض کے ساتھ یہ تم نے براؤن رنگ کی چپل کیوں پہن لی ہے...... اس پر میں نے نیچے نگاہ کی تو کچھ نظر نہ آیا اور میں نے کہا کہ کون کہتا ہے یہ براؤن ہے میں نے تو سیاہ رنگ کی چپل پہنی ہوئی ہے...... بیگم کہنے لگیں ذرا لونگ روم کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھو...... میں نے دیکھا...... اور واقعی چپل براؤن تھی...... لیکن یہ بیگم کی غلطی تھی اس نے کیوں دونوں رنگوں کی چپلیں ساتھ ساتھ رکھی ہوئی تھیں...... اگر وہ صرف سیاہ چپل رکھتی تو مجھ سے یہ غلطی ہرگز نہ ہوتی...... میں تو کپڑے بدل کر پلنگ پر بیٹھا اور بمشکل جھک کر وہ چپل ٹٹول ٹٹول کر پہن لی...... اس وقوعے کے چند روز بعد میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اونگھ آ گئی...... تھوڑی دیر بعد جاگا ہوں تو پین غائب...... میں نے سوچا کہ بیٹا لے گیا ہے کیونکہ میرا پین زیادہ لکھنے سے رواں ہو جاتا ہے اور پھر بچے چوری کر لیتے ہیں...... بیٹے کو آواز دے کر بلایا...... اسے ڈانٹا کہ بدتمیز بچے میں ملک و قوم کو سدھارنے کی خاطر ایک نہایت ہی دردمندانہ کالم لکھ رہا تھا اور تم میری اونگھ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا قلم لے گئے۔ حیرت انگیز طور پر بچے کو کوئی شرمندگی نہ ہوئی بلکہ وہ مسکراتا رہا اور پھر کہنے لگا: "ابو قلم تو آپ کے پاس ہے......"

"کہاں ہے؟" میں نے گرج کر کہا: "میرے سامنے میز پر تو کہیں نہیں ہے"۔

"آپ ذرا ٹھوڑی نیچے کر کے دیکھیں آپ کی توند پر آرام کر رہا ہے"۔

اور واقعی ایسا ہی تھا...... میں نے اپنے تئیں اسے میز پر رکھا تھا لیکن کرسی اور میز کے درمیان میری توند تھی جس پر قلم رکھا تو وہ وہیں ٹکا رہا...... لیکن اس موٹاپے کا ایک فائدہ یہی ہوا ہے کہ آپ لکھتے لکھتے تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتے ہیں تو قلم کو میز کے بجائے توند پر رکھ دیجئے...... بعد میں تلاش کرنے میں بے حد آسانی ہو جاتی ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم پاکستانی جسمانی طور پر دنیا کی بھدی ترین قوموں میں شمار کیے جاسکتے ہیں...... خاص طور پر میری عمر کے پاکستانی...... کیا یہ ہمارے جینز میں ہے' خوراک میں ہے یا موسم میں ہے کہ قیلولے سے ہی فرصت نہیں ملتی...... کیا وجوہات ہیں یہ میں نہیں جانتا...... اگر جانتا تو آج میری یہ ''پوزیشن'' نہ ہوتی میرا خیال ہے اس کی وجہ ہماری ثقافت ہے...... میزبان ہمیشہ مہمان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اجی حضرت آپ نے تو کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا...... یہ نرگسی کوفتے آپ کی راہ تک رہے ہیں...... پلاؤ آپ نے ایک مرتبہ چکھ کر چھوڑ دیا۔ یہ حلیم میری بیگم نے صرف آپ کے لیے بنایا ہے آپ پورا ڈونگا نوش نہیں کریں گے تو وہ برا مان جائے گی...... اور ان سری پایوں کی جانب آپ ملتفت ہی نہیں ہوئے اور قیمے والے نان ٹھنڈے ہو رہے ہیں...... ادھر مہمان کا ناک میں دم آیا ہوا ہے کہ پیٹ میں تو جگہ باقی نہیں بچی تو دم بیچارہ کہاں سے نکلے...... اگر میزبان صرف اصرار کرنے تک ہی قناعت کرے تو بھی خیریت ہے لیکن اکثر اوقات موصوف ڈونگے اٹھا اٹھا کر چنیدہ بوٹیاں اور روسٹ چکن وغیرہ زبردستی آپ کی پلیٹ میں رکھتے جاتے ہیں کہ حضور کچھ تو کھائیے...... اب حضور اگر اس پلیٹ میں تعمیر کردہ خوراک کے اہرام کو نوش نہ کریں تو بدتمیزی ٹھہرتی ہے...... اس کے بعد میٹھے کی باری آجاتی ہے اور مہمان کو شاہی ٹکڑوں اور حلوے وغیرہ سے ٹھونس دیا جاتا ہے ادھر مغرب میں اول تو اس قسم کی دعوتوں کا رواج ہی نہیں...... غلطی سے کھانے کے وقت کسی کے گھر چلے جائیں تو موصوف آپ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ہم ذرا ڈنر کرلیں آپ اتنی دیر ہمارے کتّے سے کھیلئے''۔ اور اگر کھانے پر بلالیں تو دو چار ابلے ہوئے آلو اور گوشت کا ایک قتلہ پلیٹ میں رکھ کر دوبارہ پوچھتے تک نہیں...... کھانے کا نہیں پوچھتے پینے کا پوچھتے ہی چلے جاتے ہیں...... ویسے شنید ہے کہ انگریزوں نے اپنی بدذائقہ خوراک کی وجہ سے آدھی دنیا فتح کرلی تھی...... ایسی خوراک کھانے کے بعد نہ انسان قیلولہ کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اطمینان سے بیٹھنا چاہتا ہے بلکہ اتنا بیزار ہوتا ہے کہ گھر سے ہی نکل جاتا ہے اور دوسروں کے گھروں پر جاکر ان پر قبضہ کرلیتا ہے...... جب سے انگریزوں نے اپنی خوراک کم کر کے پاکستانی خوراک کھانی شروع کی ہے آپ چیک کرلیجئے کہ کوئی ایک ملک بھی فتح نہیں کرسکے۔

ہماری ثقافت میں بھی ہے کہ ذرا کوئی شخص چھریرے بدن کا ہوا...... دبلا پتلا ہوا تو اسے یار لوگ ڈھینگر۔ اوئے تیلے اور اوئے مچھر کہہ کر پکارنے لگتے ہیں اور وہ تنگ آکر وزن بڑھانے کی دوائیاں کھانے لگتا ہے...... ایک بار میری مرحومہ خالہ جان میرے ہاں تشریف

لائیں اور میز پر رکھے ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کرنے لگیں...... اس کے درمیانی صفحات پر ایک ماڈل کی تصویریں تھیں جو نئے فیشن کے زیورات کی نمائش کررہی تھی...... تھوڑی دیر کے بعد خالہ جان نے مجھ سے کہا: ''ہاہائے مستنصر...... ذرا دیکھو تو سہی اس لڑکی نے لاکھوں کے زیور پہنے ہوئے ہیں پر کھاتی پیتی کچھ نہیں...... جسم پر ایک بوٹی نہیں ہے ماس کی...... اگر تمہاری واقف ہے تو اس بے چاری کا کچھ کرو''...... وہ بیچاری میری واقف ہوتی تو میں ضرور کچھ نہ کچھ کرتا...... خالہ جان خود بھی ماشاءاللہ بڑے ڈیل ڈول کی تھیں اور ہمیشہ اپنی بہوؤں سے شاکی رہتیں کہ آج کل کی لڑکیوں کے جسم پر ایک بوٹی نہیں ہوتی...... انہیں ہمیشہ ڈٹ کر کھانے پینے کی تلقین کرتیں اور کہتیں کہ چودھریوں کی بہو وہ ہوتی ہے جو ایک کلومیٹر سے آتی دکھائی دے...... اب تو خیر سے یہاں بھی سلم اور سمارٹ رہنے کا رواج ہو گیا ہے لیکن یہ برائی مغرب سے آئی ہے انگلستان میں اگر ایک خاتون آپ سے ملنے کے لیے آرہی ہو اور جب وہ بہت ہی قریب آجائے بلکہ عنقریب آجائے اور آپ حیرت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ اوہو مارگیٹ تم تو اتنی دبلی ہوگئی ہو کہ دکھائی ہی نہیں دیتیں تو مارگریٹ آپ پر جان نچھاور کردے گی...... اگر اس میں کوئی جان ہو تو......

ہماری قومی تاریخ میں بھی قائداعظمؒ ہی ایک ایسے لیڈر تھے جن کے جسم پر میری خالہ جان کے بقول ماس کی ایک بوٹی بھی نہ تھی...... بعد میں آنے والے اکثر رہنماؤں نے قوم کی بوٹیاں نوچ کر اپنے جسموں کو بھر لیا...... اس لیے موٹے ہوگئے......

نہ صرف مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میری توند کم کیوں نہیں ہو رہی بلکہ پارک میں میرے ہمراہ سیر کرنے والے کچھ دوستوں کے پلّے بھی یہ بات نہیں پڑتی کہ روزانہ سیر کرتے ہیں تو وزن کم کیوں نہیں ہوتا...... ان میں گورے چٹے اور ہینڈسم آغا صاحب بھی ہیں جو بہت آہستگی سے چلتے ہیں کہ خاصے تنومند ہیں اور پورا ہفتہ دیگر دوستوں کو ڈانٹتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی خوراک کا خیال نہیں رکھتے' کھانے میں احتیاط نہیں برتتے اس لیے ان کا وزن کم نہیں ہوتا لیکن اتوار کے روز ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے...... سیر کے بعد ایک بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یار آج تو چھٹی ہے گھر جاکر کیا کریں گے...... گھر والے آرام کررہے ہوں گے انہیں صرف ناشتے کے لیے بے آرام کرنا مناسب نہیں...... یار ادھر سے کہیں کچھ زہر مار کرلیتے ہیں...... ایک روز مجھے بھی گھیر لیا اور ناشتے کے لیے لے گئے۔ بہت سارے دوسرے بابے بھی ہمراہ تھے جنہیں آپ مرزا صاحب' شاہ صاحب' قاضی صاحب' شیخ صاحب وغیرہ کہہ سکتے ہیں...... پہلے تو مارکیٹ میں جاکر سب نے پیالے بھر بھر کے دہی

کھایا۔ پھر پیڑے ڈلوا کر دو دو گلاس لسّی کے پیے اور اس کے بعد ناشتہ شروع ہوا اور دکاندار پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بونگ اور نہاری کے دیگچوں پر قابض ہو کر اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے چنیدہ بوٹیاں پلیٹوں میں مسلسل ڈالتے گئے اور انہیں روغنی نانوں کے ساتھ نوش فرماتے رہے پھر دودھ پتی کے چائے کا دور چلا جس کے ساتھ برفی لازمی تھی...... اس دوران سامنے کی دکان میں حلوہ پوری کی گرما گرمی شروع ہو گئی چنانچہ اسے بھی چکھ لیا گیا...... آخر میں آغا صاحب نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا...... یار واب تو بھوک ہی نہیں لگتی...... اگلے روز تو ان میں سے آدھے بابا لوگ سیر سے غائب تھے لیکن اس سے اگلے روز آغا صاحب پھر شکایت کر رہے تھے کہ یار وا تنی سیر کرتا ہوں لیکن وزن کم نہیں ہوتا۔ تم لوگ کھانے میں احتیاط کیا کرو......

مجھے بھی یہی شکایت ہے کہ اتنی سیر کرتا ہوں لیکن توند کم نہیں ہوتی...... پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے...... بہر حال اس کا ایک فائدہ تو ہے کہ لکھتے لکھتے آرام کرنے کو جی چاہے تو قلم توند پر دھر کر اونگھ لیتا ہوں اور بیدار ہونے پر تلاش نہیں کرنا پڑتا...... تو اب اجازت دیجئے...... خوش رہو اہل وطن ہم تو توند پر قلم دھر کے اونگھنے لگے ہیں۔

☆☆☆

"راگ بسنت بہار گانے کے دن......!"

خلیفہ خلفشاری جو ہمیشہ تصویر کا تاریک رخ دیکھتے ہیں...... بنیادی طور پر قنوطی شخص ہیں۔ ہمیشہ ناخوش رہتے ہیں اور بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ خلق خدا بھی ناخوش رہے...... کبھی شے کا روشن پہلو نہیں دیکھتے۔ بسنت سے ایک روز پہلے آئے ہیں تو باقاعدہ جھومتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے اور آتے ہی میری کمر پر ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "یار زندگی کتنی خوبصورت ہے"۔

"خلیفہ......" میں ان کے لیے فکرمند ہو گیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں میری طبیعت تو ٹھیک ہے تمہارا کیا حال ہے؟" انہوں نے میری کمر پر ایک اور دھپ رسید کی۔

"تمہیں زندگی سے کوئی شکایت نہیں...... کوئی گلہ نہیں......"

"مجھے تو صرف تم جیسے لوگوں سے شکایت ہے جو ہمیشہ حالات کا رونا روتے رہتے ہیں...... زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ قنوطی کہیں کے......"

"تمہیں آج ہوا کیا ہے خلیفہ......"

"مجھے بہار ہو گئی ہے"۔

"وہ تو غالباً خاصی بوڑھی ہو گئی ہے"۔

"میں کسی ایکٹرس کی بات نہیں کر رہا...... اس بہار کی بات کر رہا ہوں جس کے بارے میں چچا غالب نے کہا ہے کہ ؎

آمد بہار کی ہے بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی خبر ملی ہے زبانی طیور کی

"نہیں تو ان طیور نے صرف تمہیں خبر کی ہے۔"

"طیور تو بے چارے ہر ایک کو خبر کرتے ہیں لیکن تم جیسے زندگی سے بیزار لوگ اول تو کان نہیں دھرتے اور اگر کان دھرتے ہیں تو خبر کا اعتبار نہیں کرتے۔"

"لیکن خلیفہ بہار تو ہر سال آتی ہے...... اور تم ہمیشہ کی طرح منہ پھلائے ناراض ناراض پھرتے ہو اس برس کوئی خاص بات ہے بہار میں......"

"ذرا ناک اونچی کر کے ہوا کو سونگھو...... یوں!" انہوں نے اپنی لمبی ناک فضا میں بلند کر کے ہوا کو ایک "ڈوگی" کی طرح سونگھا۔

میں نے بھی ان کی خواہش کے مطابق یہی عمل دہرایا۔

"اب بولو کوئی مہک آئی؟"

"ہاں ساتھ والوں کا گٹر کھلا ہے اس کی بو آ رہی ہے اور کسی کی ہانڈی جل گئی ہے تو اس کی ناگوار سی بو ہے...... اور شاید تم بہت دنوں سے نہائے نہیں تو اس کی اطلاع بھی بذریعۂ ناک وصول ہو رہی ہے۔"

"بھئی عجیب گھامڑ شخص ہو"۔ خلیفہ ناراض ہو گئے۔ "بھئی فضا میں بہار کی مہک ہے...... ایک مست الست خوشبو ہے اور تم ایسے کور ذوق ہو کہ ہانڈی کے جلنے کی بات کرتے ہو یعنی دل جلانے کی بات کرتے ہو...... ادھر ہم ہیں کہ وہ گانا گانے کو دل مچلتا ہے کہ بہار و پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے"۔

میں نے سوچا کہ خلیفہ چونکہ میرے ہم عمر ہیں اس لیے شاید ذہنی طور پر تھوڑے سے غتربود ہو گئے ہیں جو کہ اس عمر میں آ کر انسان ہو جاتا ہے ورنہ وہ تو ہر بات کو "نامنظور نامنظور" کہہ کر رد کر دیا کرتے ہیں یہاں تک کہ شادی کے روز بھی ان کے قبلہ والد صاحب نے ان کا ٹینٹوا دبا کر "منظور" کہلوایا تھا۔ "خلیفہ میرا خیال ہے کہ تمہارا ابلڈ پریشر بڑھ گیا ہے کیونکہ تم آج وہ گولی کھانا بھول گئے ہو جس سے تمہارا خلفشار خون کنٹرول میں رہتا ہے...... میرے پاس وہ گولی ہے، پیش کروں؟"

"ارے میاں بہار میں کس ناہنجار کو گولی کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہار میں ہر مرض کی دوا ہے...... وہ کونسی ٹھمری ہے یا کیا ہے کہ...... لو پھر بہار آئی...... اگر یاد ہے تو سنا دو"۔

صورت حال بے حد تشویشناک تھی...... اور اس میں خلیفہ کی ناک کو بھی عمل دخل تھا جسے وہ ہر دو چار لمحوں کے بعد اونچی کر کے ہوا کو سونگھتے تھے اور مسکراتے تھے۔

"دیکھو خلیفہ...... خدا کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ اس برس ہی تم یہ بہار کیوں آئی

ہے میرا مطلب ہے اتنی شدت سے اثر انداز ہوئی ہے اس کا کوئی نہ کوئی جواز تو ہو گا"۔

"ہاں ہے"۔ وہ خوش ہو کر بولے۔

"کیا ہے؟"

"بھئی پہلے تو بہار آتی تھی تو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی...... طیور شور مچا مچا کر چلے جاتے تھے لیکن ہمیں خبر نہیں ہوتی تھی...... اور اس مرتبہ بھی بے خبری رہتی اگر میں یونائیٹڈ اسپتال کے باہر ایک خصوصی اعلان نہ پڑھ لیتا۔ تم بے شک وہاں جا کر چیک کر لو، ایک بورڈ پر لکھا ہے کہ...... "آمد بہار پر بسنت کے موقع پر ہونے والے حادثات کے علاج کے لیے خصوصی انتظام کیا ہے۔ اسپتال چوبیس گھنٹے کھلا رہے گا...... چھتوں سے گرنے والے بچوں کے لیے ہڈیاں جوڑنے والے ماہرین بھی موجود ہیں۔" تب مجھے اپنی قوم کی زندہ دلی پر بے حد فخر ہوا کہ بہار کی آمد پر ہم نے کیسے کیسے شاندار انتظامات کر رکھے ہیں...... اور میں کتنا بے حس ہوں کہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو رہا...... چنانچہ مجھے بھی بسنت بخار ہو گیا...... بھئی پوری قوم اس بخار میں مبتلا ہے تو میں اپنے ہم وطنوں کا ساتھ کیسے نہ دوں...... اگر سرحدوں پہ صورت حال کشیدہ ہے...... صدر کلنٹن فی الحال پاکستان نہیں آ رہے...... معاشی حالت بھی حسب معمول دگرگوں ہے...... مہنگائی کا گراف بھی نیچے نہیں آ رہا اور بچوں کو اسکولوں میں داخلے نہیں مل رہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم بہار اور بسنت سے لطف اندوز نہ ہوں"۔

"خلیفہ میں تمہارے ملی جذبات کی قدر کرتا ہوں...... لیکن یار میں عجیب مخمصے میں ہوں...... میں خود ایک زمانے میں پتنگ باز سجناں ہوا کرتا تھا اور مخدوش مٹیوں کو پھلانگتا کسی چھوٹی سی دو آنے والی گڈی لوٹنے کے لیے جان کی بازی لگا دیا کرتا تھا...... بسنت کے دن منہ اندھیرے کوٹھے پر چڑھ جاتا تھا اور گئی رات والد صاحب کان پکڑ کر نیچے لے جاتے تھے...... کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں بسنت کے خلاف ہرگز نہیں ہوں لیکن کبھی تو اس تہوار کو ہندوؤں کے کھاتے میں ڈال کر اسے غیر اسلامی قرار دے دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف جلوس نکلتے ہیں اور دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ خبردار جو کسی نے پتنگ یا ڈور کو ہاتھ لگایا تو...... اور کبھی...... مثلاً اس بار...... اسے یوم آزادی سے بھی بڑھ کر اہمیت دی گئی ہے۔ شاہراہوں پر پتنگوں سے آرائش کی گئی ہے...... بسنت میلے ہو رہے ہیں...... کسی سٹور میں خریداری کریں یا کار میں پٹرول ڈلوائیں تو وہ تحفے کے طور پر ایک پتنگ تھما دیتے ہیں۔ ریڈیو پر خصوصی پروگرام ہو رہے ہیں یہاں تک کہ بسنت کے حادثات کے لیے بھی میڈیکل سٹاف کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئی ہیں...... تو ہم مڈل آف دی روڈ کیوں نہیں رہ سکتے...... کبھی انتہائی

بائیں بازو کے ہو جاتے ہیں اور کبھی دائیں جانب لڑھک جاتے ہیں"۔

"اوہو میاں یہ تو ہمارا مزاج ہے...... کوئے یار سے نکلیں تو سیدھے سوئے دار چلے جاتے ہیں' راہ میں اور کوئی مقام نہیں جچتا۔ ویسے تم کیوں اعتراض کرتے ہو...... قوم خوش ہو رہی ہے...... بہار اور بسنت منا رہی ہے اور تم اعتراض کرتے ہو"۔

"یار خلفشاری...... میں اعتراض تو نہیں کرتا...... میلے ٹھیلے اور تہوار ہر تہذیب یافتہ انسان کے لیے ضروری ہیں...... دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے...... زندگی کی ناہمواریاں کچھ لمحوں کے لیے بھول جاتی ہیں...... لیکن کوئی نہ کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ درست کہ کھیل تماشے میں حادثے ہو جاتے ہیں...... لیکن اپنے شوق کی خاطر دوسروں کی جان سے تو نہ کھیلیں...... اگلے روز واپڈا کا ایک غریب اہلکار...... کیونکہ امیر اہلکار تو دفتروں اور کاروں میں ہوتے ہیں تو ایک اہلکار بجلی کو بحال کرنے کی کوشش میں تاروں میں الجھی کسی پتنگ کی آہنی ڈور کو ہاتھ لگاتا ہے تو شاک لگنے سے وہیں بھسم ہو جاتا ہے...... اس کے بچے کس سے فریاد کریں"۔

"بھئی اس بار تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں...... انتہائی انقلابی اقدام اٹھائے جا رہے ہیں...... مثلاً آپ آہنی ڈور استعمال کریں گے تو آپ کو موقع پر سزا ہو جائے گی اور کوٹھوں پر فائرنگ کرنے والے بھی گرفتار کر لیے جائیں گے"۔

"یعنی انتظامیہ اسی نیک کام میں مشغول رہے گی۔ ڈاکو حضرات اور کاریں چھیننے والے شرفاء کی طرف ذرا کم دھیان دے گی۔ مجھے پچھلی بسنت رات یاد ہے جب لاہور کا آسمان خاص طور پر پرانے شہر کے اوپر جو آسمان تھا وہ یوں روشن ہو رہا تھا جیسے در و دیوار کو آگ لگ گئی ہے۔ فلڈ لائٹس نے پورے سال کے لیے کافی بجلی صرف کر کے زندہ دلان کی پتنگوں اور گڈیوں کے نصیب جگا دیئے تھے۔ مجھے اس روشن آسمان سے بہت ڈر لگا تھا جیسے وہ جلتے ہوئے روم کا آسمان ہو اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں نیرو اپنی چھتوں پر بانسریاں بجا رہے ہوں"۔

"میاں تم ہمیشہ تصویر کا تاریک رخ ہی دیکھتے ہو......"

"پہلے تم بھی دیکھا کرتے تھے اب میں تم سے متاثر ہوا ہوں تو تم بہار سے متاثر ہو گئے ہو"۔

خلیفہ یکدم چپ ہو گیا۔ اس کی بے پایاں مسرت جو چھلکتی تھی مدھم ہو گئی۔ مسکراہٹ بھی سمٹ گئی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا: "سچ پوچھو تو میں تصویر کا تاریک رخ دیکھتے دیکھتے اکتا گیا تھا...... اور میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ کیا یہ تاریک رخ صرف مجھے ہی نظر آتا ہے۔ دوسروں کو نظر کیوں نہیں آتا تو میں نے سوچا مفاہمت کر لی

جائے۔ عوام الناس کے ساتھ مل کر بہار اور زندگی سے لطف اندوز ہوا جائے۔ اگر انہوں نے ڈوبنے کا فیصلہ ہی کر رکھا ہے تو ان کے ساتھ ہی ڈوبا جائے۔ اب مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ سو بچوں کے قاتل جاوید اقبال کو پھانسی ہوتی ہے یا نہیں...... اگر کسی اور ملک میں اتنے بچے تیزاب میں حل کر دیئے جاتے تو وہاں کہرام مچ جاتا...... زلزلہ آ جاتا...... لیکن یہاں سوائے سنسنی خیز خبروں کے اور ٹیلیویژن پر اپنے جگر گوشوں کے بوٹ اور کپڑے پہچانتی ماؤں کے اور کچھ نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ یہ سب بچے غریب اور بے آسرا گھرانوں کے تھے۔ ان گھرانوں کے نہیں تھے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہائے میرے بچوں کو وزیراعظم ہاؤس میں رہنے کی عادت ہو گئی تھی اور وہاں سے نکلنے پر وہ بے چارے اپ سیٹ ہو گئے ہیں...... یا یہ کہ میرے بچے کو حوالات میں وہ ناشتہ نہیں ملتا جس کی اسے عادت ہے...... ایسے گھروں کے یہ بچے ہوتے تو اعلان جنگ کر دیا جاتا۔ اس لیے میں نے اب دل کو جلانا چھوڑ دیا ہے...... لیکن ایک بات ہے...... بسنت میں اور پتنگ بازی میں ہمارے لیے بے شمار معرفت کی باتیں ہیں اور ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں"۔

"مثلاً خلیفہ...... پتنگ بازی میں ہمارے لیے کیا سبق ہے"۔

"یہی کہ...... بے شک آپ کی پتنگ بہت بڑی ہو...... ڈور اعلیٰ درجے کی ہو...... اور آپ کے حواری آپ کا حوصلہ بڑھا رہے ہوں اور اگر آپ آس پاس اڑتی چھوٹی چھوٹی گڈیوں کو کاٹنے لگیں گے...... جنہیں آپ کی پتنگ کے باوجود اس آسمان پر اڑنے کا حق ہے تو بالآخر کوئی ایسی گڈی آئے گی جو آپ کی ڈور کاٹ دے گی اور پتنگ ایسے غائب ہو گی جیسے کبھی تھی ہی نہیں...... یعنی قسمت کی خوبی دیکھیئے ٹوٹی کہاں پتنگ...... اور دوسرا سبق یہ ہے کہ آپ کسی اور ملک میں رہ کر وہاں سے پتنگ اڑا کر پاکستان میں پیچ نہیں لگا سکتے...... اس کے لیے پاکستان آنا شرط ہے"۔

"تو خلیفہ اب ہم دونوں کیا کریں؟"

"ہم نے کیا کرنا ہے۔ ہم بھی زندہ دلان ہو جاتے ہیں۔ آہنی تار کی ڈور سے پتنگیں اڑاتے ہیں' فائرنگ کرتے ہیں' فلڈ لائٹس روشن کرتے ہیں بھلے مستقبل تاریک دکھائی دے گڈیاں اور پتنگیں تو دکھائی دیں گی...... بے وقوف لوگ بجلی کی روشنی میں کتابیں پڑھتے ہیں...... عقل مند قومیں اس کی روشنی میں پیچ لڑاتی ہیں۔ یوں بھی بسنت کے حادثوں کے لیے اسپتالوں میں خصوصی انتظامات کر دیئے گئے ہیں اس لیے ڈر کاہے کا...... مزے اڑاؤ...... بہار مناؤ...... پتنگیں اڑاؤ...... روم جل رہا ہے تو جلنے دو...... راگ بسنت بہار گاؤ"۔

☆☆☆

”وارے وارے جائیے انگریز سرکار کے“

آزادی سے پیشتر کا قصہ ہے کہ ایک سردار جی لاہور سٹیشن پر پہنچے..... امرتسر کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر جاکر امرتسر جانے والی ٹرین میں جا بیٹھے..... ٹرین کی روانگی سے ذرا پہلے خیال آیا کہ گرمیوں کا زمانہ ہے' راستے میں پیاس لگے گی تو کیوں نہ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا جائے..... چنانچہ ٹرین سے باہر آئے لیکن اس پلیٹ فارم پر پانی کا انتظام نہ تھا اس لیے سٹیشن سے باہر جاکر پانی پیا اور واپس آ گئے اس دوران امرتسر جانے والی ٹرین روانہ ہو چکی تھی اور اس کی جگہ راولپنڈی جانے والی ٹرین آ کھڑی ہوئی تھی..... سردار جی اطمینان سے اس میں بیٹھ گئے..... جب یہ ٹرین روانہ ہوئی تو گپ شپ لگانے کے لیے اوپر والی نشست پر لیٹے صاحب سے پوچھنے لگے: ”کیوں بھائی صاحب آپ کہاں جارہے ہیں؟“

ان بھائی صاحب نے نیچے جھانک کر کہا: ”راولپنڈی“۔

اس پر سردار جی بے حد خوش ہوئے اور کہنے لگے: ”وارے وارے جائیے انگریز سرکار کے..... ٹرین ایک ہی ہے لیکن اوپر والے مسافر راولپنڈی جارہے ہیں اور ہم جو نیچے بیٹھے ہیں' امرتسر جارہے ہیں“۔

ہم ایک عرصے تک اسے لطیفہ سمجھتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ سردار صاحب تو بالکل سچ کہتے تھے کہ ٹرین ایک ہی ہوتی ہے لیکن وارے وارے جائیے انگریزوں کے کہ نیچے والے مسافر کہیں اور جارہے ہوتے ہیں اور اوپر والے کہیں اور..... یہ ٹرین بے شک اخلاقیات کی ہو' سیاست کی ہو یا کرکٹ کی بس فرق یہ ہے کہ جو مسافر اوپر ہیں' وہ ہمیشہ انگریز یا سفید فام ہوتے ہیں اور نیچے والے مسافر ہمیشہ افریقی یا ایشیائی ہوتے ہیں.....

اب کرکٹ کی ٹرین کو ہی لیجیے..... اس میں وسیم اکرم اور سلیم ملک وغیرہ جب سوار تھے تو

آسٹریلیا میں واویلا مچ گیا کہ جناب یہ کھلاڑی تو میچ فکسنگ کرتے ہیں اور خاص طور پر شین وارن صاحب نے حلفیہ بیان دیا کہ مجھے انہوں نے آفر لگائی تھی..... کیونکہ الزام لگانے والے گورے صاحب تھے اس لیے یورپی اور آسٹریلوی اخباروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ جی ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ پاکستانی بے ایمان ہیں' کرکٹ ایسے شرفاء کے کھیل میں بال ٹمپرنگ کرتے ہیں بلکہ عمران خان نے تو اقرار بھی کر لیا ہے..... یہ ایشیائی ہوتے ہی ایسے ہیں ورنہ ان کی یہ مجال کہ یہ ہمارے ہی ملک میں آکر ورلڈ کپ جیت کر لے جائیں' ان کے تمام بالر ایسا ہی کرتے ہیں اور اب ہمارے معصوم بوائز کو ورغلایا گیا ہے' اس کی انکوائری کریں اور پاکستانیوں کا حقہ پانی بند کر دیں..... چنانچہ یہ سب کچھ ہوا..... آسٹریلیا کے شریف اور معصوم کھلاڑیوں نے نہ صرف گواہیاں دیں بلکہ پریس میں لگاتار بیان دیتے رہے لیکن آخرکار ثابت کچھ بھی نہ ہوا..... اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہی شین وارن نہ صرف خود مجرم نکلے بلکہ ان کا جرم ثابت بھی ہو گیا اور آسٹریلین کرکٹ بورڈ نے انہیں صرف جرمانہ کر کے چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ خبردار کیا کہ بھئی آئندہ احتیاط کرنا..... یورپ اور آسٹریلیا کے اخبارات نے بھی اس خبر کو نہایت احتیاط سے چھاپا اور کہیں بھی ان کے لیے بے ایمان وغیرہ کے الفاظ استعمال نہ کیے بلکہ ان سے اظہار ہمدردی کیا کہ بس معصوم بچے تھے' انجانے میں غلطی ہو ہی جاتی ہے..... انہیں زیادہ اپ سیٹ نہیں کرنا چاہیے ورنہ ان کی گیم پر اثر پڑے گا۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ ٹرین ایک ہی ہے اور وسیم اکرم کہیں اور جارہے ہیں اور شین وارن کہیں اور.....

ابھی پچھلے دنوں اس صدی کے دس عظیم کھلاڑیوں کا چناؤ کیا گیا تو ان میں شین وارن صاحب بھی شامل تھے' اگرچہ ثقلین مشتاق کی کارکردگی اس سے کہیں بہتر تھی.....

اسی شین وارن نے پچھلے دنوں یہ بیان دیا ہے کہ انگلینڈ کی ٹیم ویسے تو بہت اچھی ہے لیکن اس کے کپتان بہت برے ہوتے ہیں..... یعنی مائیک ایتھرٹن اور ناصر حسین..... موصوف کا کہنا ہے کہ میں ناصر حسین کو ذاتی طور پر جانتا ہوں' اچھا کھلاڑی ہے لیکن انگلینڈ کی کپتانی کے قابل نہیں ہے صرف اس لیے کہ ناصر حسین اگرچہ آدھے انگریز ہیں ماں کی جانب سے لیکن مسلمان ہیں اور برصغیر کا خون ہیں اس لیے وہ کپتانی کے قابل نہیں..... یہاں بھی ملاحظہ کیجیے کہ ٹرین ایک ہی ہے یعنی کپتانی کی لیکن گورا لوگ کہیں اور جاتے ہیں اور مسلمان لوگ کہیں اور روانہ کر دیے جاتے ہیں..... برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر.....

لیکن اس دورخی ٹرین کا سب سے بڑا شاہکار اب سامنے آیا ہے یعنی جنوبی افریقہ کے سب سے بڑے سپورٹس ہیرو..... نہایت مذہبی اور سچے کھلاڑی ہنسی کرونیے..... جب

ہندوستان کی جانب سے اس پر رقم وصول کر کے میچ فکسنگ کا الزام لگا تو یورپ اور جنوبی افریقہ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ کالا لوگ ہمارے ہیروز پر کیچڑ اچھالتا ہے...... کرونیے ہمارے ملک کا ضمیر ہے...... ہمارا ہیرو ہے...... اس قسم کے کام تو صرف تیسری دنیا کے باشندے کرتے ہیں...... لیکن جب ہندوستان والوں نے کہا کہ جناب ہمارے پاس تو گواہ ہیں اور ریکارڈ شدہ ثبوت ہیں تو پھر بھی یقین نہ کیا گیا کہ ٹھیک ہے کہاں ہیں وہ ثبوت...... اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا کہ ایک روز ہنسی کرونیے صاحب نے سر جھکا کر خود ہی اقرار کر لیا کہ جی ہاں میں نے دس پندرہ ہزار ڈالر رشوت کے طور پر وصول کیے تھے اور میچ کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچائی تھیں لیکن میچ فکس نہیں کیا تھا...... چنانچہ جنوبی افریقہ کے کرکٹ بورڈ نے کرونیے صاحب کو کپتانی سے بھی فارغ کر دیا اور ٹیم سے بھی...... لیکن اس قصے کا پر لطف باب اس کے بعد کھلتا ہے...... یعنی اخبارات لکھتے ہیں کہ ہم کرونیے کی عظمت کو سلام کرتے ہیں...... اس نے کیسے کھلے دل سے اپنی غلطی مان لی ہے...... اسے جنوبی افریقہ کے لیے کھیلنا چاہیے...... کھیل میں اونچ نیچ تو ہو ہی جاتی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس وقت کتنے شدید صدمے سے دوچار ہے اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے' ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے...... اسے ہماری ہمدردی کی ضرورت ہے...... یاد رہے کہ کسی اخبار نے اور کسی اور گورے کھلاڑی نے الزامات ثابت ہونے کے باوجود' اس کے اقرار جرم کے باوجود اسے "چیٹ" یعنی بے ایمان نہیں کہا جبکہ ہمارا کوئی بھی کھلاڑی ہو' اس پر ذرا سا شک ہو تو اسے فوراً "چیٹ" کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ٹیلیویژن پر ایک کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا...... دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ظاہر ہے اس پر جو کمنٹری ہو رہی تھی' وہ بھی سن رہا تھا...... دونوں کمنٹیٹر حضرات نسلاً گورے تھے...... تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کرکٹ میچ کی بجائے ہنسی کرونیے کے بارے میں زیادہ کمنٹری کر رہے تھے...... اب مجھے ان کے فقرے ہو بہو تو یاد نہیں لیکن ان کے درمیان کچھ اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔

"جان...... یہ ہنسی کرونیے کا معاملہ تو بڑا افسوسناک ہے...... ہنسی از اے گریٹ گائے...... اس کے ساتھ یہ ہونا نہیں چاہیے تھا"۔

"ہاں پیٹر...... یہ واقعی افسوسناک ہے...... ہنسی از اے جنٹلمین...... اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کر کے اپنی شرافت کا ثبوت دیدیا ہے' دراصل وہ ایک مذہبی انسان ہے اور اس نے اقرار کرنے سے پیشتر اپنے پادری سے بھی مشورہ کیا تھا...... یہ بڑی جرأت کی بات ہے جو اس نے کی...... ایک بڑی سپورٹسمین سپرٹ کا مظاہرہ کیا ہے اس نے......"۔

"ہاں واقعی...... میں اس کے لیے بے حد ہمدردی محسوس کرتا ہوں...... ویسے جنوبی افریقہ کرکٹ بورڈ کے باس نے یہ بھی تو کہا ہے کہ میچ فکسنگ کا آغاز بہت عرصے پہلے برصغیر میں ہوا تھا...... ہنسی بے چارہ تو خواہ مخواہ مارا گیا"۔

"لیکن ایک اور مسئلہ ہے جس کی جانب توجہ نہیں کی جا رہی...... وہ ہے شعیب اختر اور مرلی دھرن کا اسٹائل...... یہ ابھی تک مخدوش ہے...... یہ بال کو تھرو کرتے ہیں"۔

"ہاں یہ مسئلہ بہت اہم ہے...... اگرچہ شعیب اختر کو کلیئر کر دیا گیا ہے لیکن ابھی بہت سارے شکوک ہیں اور کرکٹ کی بہتری کے لیے ان کا ازالہ از حد ضروری ہے...... تمہارا کیا خیال ہے؟""

"دراصل ہنسی کے افسوسناک قصے کی وجہ سے باقی مسائل پس منظر میں چلے گئے ہیں...... کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ سری لنکا کا مرلی دھرن واضح طور پر تھرو کرتا ہے"۔

"ہاں یہ خاصا واضح ہے...... اگرچہ مرلی کا کہنا ہے کہ بچپن کے ایک حادثے کی وجہ سے وہ اپنے بازو کو جھکا نہیں سکتا اور یوں لگتا ہے کہ وہ تھرو کر رہا ہے اور بورڈ نے اس توجیہہ کو قبول کر لیا ہے لیکن پھر بھی شکوک باقی ہیں"۔

"جان......! تم نے شاید نوٹ کیا ہو کہ مرلی دھرن ہمیشہ پورے بازو کی قمیض پہنتا ہے تاکہ اس کے بازو کے نہ جھکنے کا پتہ ہی نہ چلے"۔

اس کمنٹ پر مرلی دھرن کو بے ایمان ثابت کرتے ہوئے دونوں حضرات نے دل کھول کر ایک قہقہہ لگایا اور پھر سے میچ کے بارے میں کمنٹری کرنے لگے۔

یہ کیسی حیرتناک بات ہے کہ ہنسی کرونیے جرم کا اقرار کر لینے کے باوجود بے ایمان اور فریبی نہیں ہے اور شعیب اختر اور مرلی دھرن تھرونگ کے الزام سے بری ہونے کے باوجود بے ایمان ہیں اور ان کے بارے میں شکوک ہیں۔

جی ہاں آج سے 60 برس پیشتر کی طرح آج بھی انگریزوں کے وارے وارے جائیے کہ ایک ہی ٹرین کے اوپر والے مسافر شین وارن اور ہنسی کرونیے کہیں اور جا رہے ہیں اور شعیب اختر اور مرلی دھرن کہیں اور جا رہے ہیں۔

یہ وہی ٹرین ہے جس کے ڈبے میں سوار کچھ مسافر آزادی کے لیے لڑنے والے ہیں اور کچھ دہشت پسند ہیں...... اسرائیلی امن پسند ہیں اور فلسطینی قاتل' لٹیرے ہیں اور یہ ٹرین چلتی ہی جا رہی ہے اور اس پر ہمارا کچھ اختیار نہیں......

☆☆☆

”پالیسی...... یعنی چالاکی‘ عیاری‘ جوڑ توڑ“

سکول کے زمانے میں اگرچہ پڑھائی سے متعلقہ کوئی شے بھی پلّے نہیں پڑتی تھی‘ لیکن صاحب الجبرا اور انگریزی وغیرہ تو یوں شاپ سے سر سے گزر جاتے تھے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شے سر سے گزری ہے۔ انگریزی گرائمر تو آج تک سمجھ نہیں آئی اور انگریزی محاوروں کو دن رات رٹنے کے باوجود وہ پہلی فرصت میں ذہن سے نکل جاتے تھے۔ بہرحال امتحان بمشکل پاس کرنے کے لیے انہیں رٹنا ضروری تھا۔ ماسٹر صاحب طلباء کو یہ محاورے ذہن نشین کروانے کے لیے بلند آواز میں ان کو دہراتے تھے اور آخری لفظ چھوڑ دیتے تھے اور کسی لرزتے ہوئے طالب علم سے انہیں مکمل کرنے کو کہا جاتا تھا۔ مثلاً ماسٹر صاحب کہتے ”لک بیفور یُو......“ اور انگلی آپ کی جانب تیر کر دیتے ”ہاں بھئی مستنصر تو بڑی انگریزیاں بولتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پچھلے ہفتے تمہیں اوڈین سینما میں انگریزی فلم دیکھتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ اب ذرا بتاناں کہ...... لک بیفور یو...... آگے کیا ہے؟“

”لک بیفور یو...... لیک......“ میں فوراً کہتا۔

بس فوراً گوشمالی شروع ہو جاتی۔ ”اوئے لیک نہیں۔ لیپ...... لک بیفور یو لیپ...... یعنی چھلانگ لگانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لو...... ہاں تو لک بیفور یو......“

”لیک......“ میں پھر گھبرا کر کہتا۔

اس کے بعد ایک اور محاورہ شروع ہو جاتا۔ ”ہاں بھئی...... اے برڈ ان ہینڈ اِز بیٹر دین......“

دماغ پر بہت زور دینے سے کچھ موہوم سا آئیڈیا آتا کہ اس کے بعد کچھ ہندسے ہیں اور کوئی جھاڑی ہے کتنے ہندسے ہیں اور کون سی جھاڑی ہے‘ یہ بالکل یاد نہیں آتا۔ چنانچہ

ڈرتے ڈرتے محاورہ یوں مکمل کرتا۔ ”ماسٹر جی! اے برڈ ان ہینڈ از بیٹر دین بش اینڈ برڈ......“ ظاہر ہے پھر ڈانٹ پڑتی اور بتایا جاتا کہ نالائق محاورے کا مطلب ہے کہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک پرندہ جھاڑی میں بیٹھے ہوئے دو پرندوں سے بہتر ہے۔ اور نالائق کو بالکل سمجھ نہ آتی کہ آخر ہاتھ والا پرندہ جھاڑی والے پرندوں سے بہتر کیوں ہے؟ کیا وہ کوے ہیں اور یہ کبوتر ہے؟ لیکن ایک محاورہ ایسا تھا کہ میں اسے یاد رکھنے کے معاملے میں ایک جینئیس تھا۔ ادھر ماسٹر صاحب نے کہا ”ہاں جی...... آنسٹی از دی بیسٹ......“

اور ادھر میں نے شور مچا دیا۔ ”پالیسی پالیسی...... آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی۔“

اور صرف یہی محاورہ مجھے آج تک یاد ہے اور میری نہایت اعلیٰ پائے کی انگریزی کی واحد بنیاد ہے۔ لیکن سمجھ یہ بھی مجھے نہیں آیا کہ آخر کار ایمانداری بہترین پالیسی کیوں ہے اور یہ پالیسی ہوتی کیا ہے۔ پھر ذرا بڑے ہوئے تو میرے ایک خالو جان انشورنس میں ہوا کرتے تھے اور جس روز وہ بہت خوش ہوتے تھے اور ہم پوچھتے تھے کہ خالو کیا بات ہے؟ تو وہ کہتے آج ایک پالیسی مل گئی ہے یا فلاں شخص نے دو پالیسیاں کروالی ہیں۔ یوں معاملات اور زیادہ الجھ گئے کہ ایمانداری کی جگہ اب انشورنس کہاں سے آ گئی۔

سکول کے زمانے میں ہی میرا گاؤں کا ایک دوست کرم دین شیخ ہوا کرتا تھا‘ جو پھیری لگا کر آس پاس کے دیہات میں نالے پراندے اور سنک سرمہ وغیرہ بیچا کرتا تھا۔ ایک روز میں بھی اس کے ساتھ پھیری پر چلا گیا تو ایک اور دلچسپ انکشاف ہوا۔ کسی بھی گاؤں میں پہنچ کر وہ گلیوں میں اپنی پروڈکٹس کی آواز لگاتا تو مختلف عمروں کی خواتین کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے آ جاتیں۔ ان دنوں دکانیں وغیرہ کم ہی ہوتی تھیں اور خواتین ذرا چوری چھپے ”سامان آرائش“ پھیری والوں سے ہی خریدتی تھیں۔ اب کسی خاتون کو اگر کوئی رنگین پراندہ پسند آ گیا ہے تو مول تول شروع ہو جاتا۔

”بھائی یہ پراندہ کتنے کا؟“ حالانکہ وہ ”بھائی“ میری عمر کا ہی ایک نوخیز لڑکا ہوتا۔

”بہن جی ساڑھے تین روپے کا......“ یہ بھائی جواب دیتا۔

”ہائے ہائے اتنا مہنگا...... دو روپے لے لو۔“

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے مذاکرات کے بعد ڈھائی روپے میں سودا ہو جاتا لیکن بہن جی شرط پیش کر دیتیں ”ڈیڑھ روپے اب دوں گی اور ایک روپیہ ادھار...... نہیں تو نہیں لوں گی۔“

اس پر کرم دین شیخ انگلیاں نچا کر کہتا۔ ”بہن جی یہ میری پالیسی نہیں ہے۔“

بہن جی فوراً متاثر ہو جاتیں کہ اس نے پتا نہیں کیا انگریزی بولی ہے "خواہ مخواہ نہیں ہے...... نہیں ہے تو نہ سہی...... میں نے نہیں لینا پراندہ۔"

اس پر کرم دین شیخ فوراً ہتھیار ڈال دیتا اور پراندہ بہن جی کے حوالے کرتے ہوئے کہتا "ٹھیک ہے ویسے یہ میری پالیسی نہیں ہے۔"

کرم دین چونکہ شیخ تھا' اس لیے گھاٹے کا سودا نہیں کرتا تھا۔ میں پوچھتا تو کہتا "یار ڈیڑھ روپیہ میری خرید ہے۔ میرے پیسے تو آ گئے۔ اب اگر بہن جی ادھار کا ایک روپیہ ادا کریں تو موج ہو گئی ورنہ مجھے نقصان تو نہیں ہو گا۔"

"لیکن ادھار دینا تو تمہاری پالیسی نہیں ہے کرم دین......"

"یہی تو پالیسی ہے۔" وہ ہنس کر کہتا اور اگلی بہن جی کو سرمہ بیچنے لگتا۔

چنانچہ اب تک کئی پالیسیاں ہو گئی تھیں۔ آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی۔ انشورنس کی پالیسی اور کرم دین شیخ کی پالیسی۔

اس کے بعد کالج گئے تو وہاں طاہر حسن سے دوستی ہو گئی۔ طاہر ادھار دیتا نہیں تھا' لیتا تھا اور ہر کسی سے لیتا تھا اور پھر دیتا نہیں تھا۔ بعد میں فنانس ڈویژن میں ایک سینئر بیوروکریٹ ہو گیا اور نہایت کامیاب رہا۔ طاہر سے جب ہم اپنی رقم کا تقاضا کرتے تو وہ بھی ہمیشہ کہتا "یار دوستوں میں لین دین تو چلتا رہتا ہے۔ دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں۔ ویسے دوستوں کو ادھار واپس کرتے مجھے تو شرم آتی ہے' یوں بھی یہ میری پالیسی نہیں ہے۔"

ہم بہتیرا احتجاج کرتے۔ اسے زدوکوب کرنے کی دھمکیاں دیتے لیکن وہ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہتا اور یہی کہتا کہ...... یہ میری پالیسی نہیں ہے۔ چنانچہ پوری زندگی کامیابی نے طاہر حسن کے قدم چومے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے فنانس ڈویژن میں ایک اعلیٰ پائے کا بیوروکریٹ ثابت ہوا۔

پھر ہم مزید بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ دنیا اور خاص طور پر ہمارا ملک تو پالیسیوں کے تحت چلتا ہے اس لیے فیصلہ کیا کہ اب تو ہر صورت جان لینا چاہئے کہ پالیسی کا آخر مطلب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈکشنری کھولی اور بڑی مشکل سے "پالیسی" کا لفظ تلاش کیا۔ اس کے مطالب دیکھے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یعنی بیمہ کی پالیسی' سیاسی مصلحت اندیشی' طرز حکمرانی' حکمت عملی' طرز عمل' چالاکی' عیاری' جوڑ توڑ اور تدبیر جہانبانی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں کہیں بھی آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی کا ذکر نہ تھا۔ اس کا

مطلب تھا کہ ہم ساری عمر ایک غلط محاورے کو رٹتے رہے اور اس پر یقین کرتے رہے۔ آنسٹی یعنی ایمانداری کا تو چالاکی' عیاری اور جوڑ توڑ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ بہرحال دلچسپی پیدا ہوئی کہ دیکھیں تو سہی ہمارے ملک کی کیا کیا پالیسیاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ بیشمار ہیں۔ اقتصادی پالیسی' زراعتی پالیسی' تعلیمی پالیسی' کارگل پالیسی اور میڈیا پالیسی وغیرہ۔ اب اگر پالیسی کے بجائے اس کا کوئی ایک مطلب ان شعبوں کے ساتھ لگا دیا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یعنی اقتصادی چالاکی' زراعتی جوڑ توڑ' تعلیمی عیاری' کارگل سیاسی مصلحت اندیشی اور میڈیا طرز حکمرانی۔

ان سب میں سے میڈیا پالیسی ایک عجیب پالیسی ہوتی ہے۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ حکمرانوں کی نہ عوام کی۔ یہ پالیسی محاورے والا ہاتھی ہوتا ہے کہ جس کے حصے میں جو آتا ہے وہ اسے ٹٹول کر "پالیسی پالیسی" کے نعرے لگانے لگتا ہے۔ ضیاءالحق کے زمانے میں کسی کامیڈی پروگرام میں ایک ریفری بنایا گیا اور اس کی آنکھوں میں "سرمہ" ڈالا گیا۔ اس گستاخی پر میک اپ مین کے علاوہ متعدد اہلکاروں کو ملازمت سے جواب مل گیا کہ اول تو ریفری کیوں بنایا ہے اور اگر بنا ہی دیا ہے تو اس کی آنکھوں میں سرمہ کیوں ڈالا ہے۔ چنانچہ پالیسی ہو گئی کہ آپ ریفری نہیں دکھا سکتے کیونکہ ضیاءالحق صاحب نے فرمایا تھا کہ میں تو یونہی اس میدان میں آ نکلا ہوں اور بس ریفری ہوں' کھیل شروع کروا کے چلا جاؤں گا...... اور ہوا یہ کہ کھلاڑی چلے گئے لیکن ریفری صاحب دس برس کھیلتے رہے۔ انہی زمانوں میں دوپٹہ پالیسی بھی آئی اور شیمپو کے اشتہار بنانے والوں کے لیے مشکل پیش آ گئی کہ ایک خاتون کو دوپٹے کے ساتھ شیمپو کرتے ہوئے کیسے دکھایا جائے۔ پھر یہ پالیسی آئی کہ ڈرامے میں چور دکھانا ہے تو داڑھی والا نہیں ہونا چاہئے۔ بی بی بینظیر کے دور میں جھگڑالو خواتین دکھانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان دنوں پالیسی کا تعین نہیں ہو رہا' لڑکیاں جین نہیں پہن سکتیں لیکن باہر کے ملکوں میں شوٹ کیے گئے تمام ڈراموں میں بیشتر پاکستانی لڑکیاں جینیں پہن کر دندناتی پھرتی ہیں۔ جنون گروپ کے لمبے بالوں پر اعتراض ہے لیکن عارف لوہار یا رفاقت علی خاں کی خیر ہے۔ شکر ہے کہ یہ پابندی تو ختم ہوئی۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے بتایا کہ ڈراموں میں بیٹا اپنے باپ کو...... ڈیڈی...... والد صاحب...... ابو وغیرہ تو کہہ سکتا ہے لیکن "ابا جی" نہیں کہہ سکتا کہ یہ پالیسی ہے۔

دراصل اوپر...... اسلام آباد میں کوئی صاحب یونہی کہہ دیتے ہیں کہ بھئی موسم تو خوشگوار ہونا چاہئے۔ اس پر تمام ٹیلی ویژن سٹیشنوں کے پروڈیوسروں اور سکرپٹ انچارجوں

کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈراموں میں بارش کے طوفان اور بجلی کڑکنے کے مناظر پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے کہ موسم خوشگوار ہونا چاہیئے یہاں تک کہ موسم کا حال بتانے والے نہایت گھگھو قسم کے صاحب کو بھی خبر دار کر دیا جاتا ہے کہ روزانہ لوگوں کو یہی بتانا ہے کہ ناظرین موسم خوشگوار ہے اور آیندہ چوبیس گھنٹے تو کیا چوبیس برس تک خوشگوار رہے گا کہ یہی پالیسی ہے۔

ویسے اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ میں نے اتنے برسوں میں جتنی بھی پالیسیاں دیکھی اور بھگتائی ہیں' ان میں سے بہترین پالیسی کون سی ہے۔ تو میں یہی کہوں گا کہ آنسٹی از دی بیسٹ پالیسی...... جو آج تک نافذ نہیں ہوئی۔

☆☆☆

"وہ چڑیلیں تھیں پھر پریاں ہو گئیں!"

میں احساس کمتری کا مارا ہوا ایک شخص ہوں۔

میں مرنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کروں لوگ گھیر گھار کر مار دیتے ہیں...... باغ میں جاتا ہوں تو ہر دوسرا شخص ابھی ابھی امریکہ یا پیرس سے واپس آیا ہوتا ہے اور وہاں کی سڑکوں اور سٹورز کے بارے میں یوں باتیں کرتا ہے' جیسے ہم مزنگ چونگی اور پچی پان شاپ کی بات کرتے ہیں...... آج صبح شیخ صاحب نے میرے ڈھیلے ڈھالے پاکستانی جوگنگ سوٹ کو دیکھ کر کہا...... تارڑ صاحب اپنی گیٹ اپ کا خیال رکھا کریں...... یہ آپ کس قسم کے کپڑے پہنتے ہیں؟...... میں تو ہمیشہ لنڈن کے ہیرڈز سٹور سے خریداری کرتا ہوں...... مجبوری کے تحت کبھی پیرس سے بھی کچھ منگوا لیتا ہوں...... میں نے عرض کیا کہ بس جی خواہش تو میری بھی یہی ہے، لیکن ہیرڈز سٹور جانے کا موقع نہیں مل رہا...... اس لیے بھی کہ لنڈن جانے کا موقع نہیں مل رہا...... مصروفیت بہت ہے...... کہنے لگے میں اگلے ہفتے پھر جا رہا ہوں آپ پسند کریں تو آپ کے لیے ایک جوگنگ سوٹ اور نائکے کے جوگرز لے آؤں...... یہی کوئی سات آٹھ سو پاؤنڈ میں آ جائیں گے......

"سات آٹھ سو پاؤنڈ میں؟" مجھے کپکپی سی طاری ہو گئی۔

"ہاں ہاں یہی کوئی ستر اسی ہزار پاکستانی بنتے ہیں...... ہیرڈز مہنگا تو ہے لیکن کوالٹی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں وہاں سے اپنی بہو کے لیے ایک ہینڈ بیگ لایا تھا تو ڈیڑھ لاکھ میں مل گیا۔ یوں بھی ان دنوں اس کا مالک مصر کا رہنے والا ڈوڈی ہے۔ مسلمان بھائی ہے...... اس کا بیٹا مارا گیا تھا ناں شہزادی ڈیانا کے ساتھ...... تو کوئی اور چیز بھی منگانی ہو تو بتا دیں...... کرسمس کے بعد وہاں سیل لگی ہو گی...... نہایت عمدہ مفلر پچاس ہزار میں مل جائے گا۔"

اب آپ جان گئے ہوں گے کہ میں احساس کمتری کا مارا ہوا کیوں ہوں......

ابھی کل کی بات ہے کہ ایک صاحب نئی کار پر تشریف لائے...... کہنے لگے تارڑ صاحب ذرا ملاحظہ کیجیے میں نے یہ کار صرف اس کی خوبصورت ہیڈ لائٹ کی وجہ سے خریدی ہے' ورنہ کاریں تو پہلے بھی بہت ہیں......

میں نے پوچھا کہ ان لائٹ میں کیا خصوصیت ہے؟ آنکھیں مارتی ہیں' کیا کرتی ہیں؟ کہنے لگے ایک نہایت قیمتی دھات سے بنائی گئی ہیں...... ان کی خوبصورتی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اگر ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ جاتی ہے تو دوبارہ مل نہیں سکتی...... نئی کار خریدنی پڑتی ہے۔

پچھلی گرمیوں میں ایک صاحب نہایت محبت سے مجھے ملنے آئے میں نے انہیں گھر کے واحد ٹھنڈے کمرے میں بٹھایا۔ انہوں نے کچھ دیر تو ملک کی گرتی ہوئی معیشت اور غریبوں کی زبوں حالی پر مجھے ایک لیکچر دیا' پھر کہنے لگے یہاں شور بہت ہے۔ یہ کس چیز کی گڑگڑاہٹ ہے ڈسٹرب کر رہی ہے۔ میں نے نہایت فخر سے کہا کہ جناب عالی یہ ایئرکنڈیشنر کی آواز ہے۔ ذرا پرانا ہو گیا ہے لیکن کمرے کو خوب ٹھنڈا کرتا ہے۔

انہوں نے تبسم فرمایا اور بولے...... "تارڑ صاحب آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ اتنے شور میں دل جمعی سے کیسے لکھ لیتے ہیں۔ آپ تو ادیب لوگ ہیں ذرا سی آواز سے آپ کے خیالات عالیہ پُھر کر کے اُڑ سکتے ہیں...... میری مانئے تو آپ سپلٹ یونٹ لگوا لیجیے...... میں نے تو پچھلے برس تمام ایئرکنڈیشنرز اتروا کر سپلٹ یونٹ لگوا لیے ہیں' بالکل بے آواز ہیں اور ایئرکنڈیشنروں کی طرح بھدے بھی نہیں لگتے...... یوں بھی کمروں کے اندر ہوتے ہیں تو بجلی والوں کی نظر میں نہیں آتے...... تین چار لاکھ کا خرچہ ہے اور ساری عمر کا آرام ہے......"

ویسے آپس کی بات ہے مجھے ہیئرز کے ملبوسات' خوبصورت ہیڈ لائٹ اور سپلٹ یونٹ کا اتنا شوق نہیں کہ میں احساسات کمتری سے مکمل طور پر مارا جاؤں لیکن کل شام میرے نائی...... معاف کیجیے گا ہیئر ڈریسر نے جو کچھ مجھ سے کہا اس نے واقعی مجھے مار دیا......

میں حسب معمول دو چار ماہ کے بعد اپنے ہیئر ڈریسر کے پاس چلا جاتا ہوں اور وہ بھی صرف اس صورت میں جب بیگم گھر سے دھکے دے کر نکال دیتی ہیں کہ جاؤ حجامت کروا کے آؤ کیا بوڑھے ریچھوں کی طرح بال بڑھائے پھرتے ہو...... تو جناب کرسی پر بیٹھتے ہی میرے ہیئر ڈریسر نے میرے بالوں میں کوئی گوند نما شیمپو انڈیلا اور چمپی شروع کر دی۔ میں نے

احتجاج کیا کہ بھائی ہمیشہ حجامت کے بعد گھر جا کر نہاتا ہوں صاحب لوگوں کی طرح کوٹ کا کالر جھاڑ کر سیدھا کسی پارٹی میں نہیں چلا جاتا...... شیمپو کی ضرورت نہیں......اس پر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی......"جناب چپکے سے بیٹھے رہئے...... آپ کی عزت' بے عزتی کا سوال ہے......لوگ بہت باتیں بناتے ہیں آپ کے بارے میں......"

"کیا باتیں بناتے ہیں؟" میں نے بالوں میں سے گرتی جھاگ کو آنکھوں میں سے پونچھا......

"جناب آپ صرف بال کٹوا کر چلے جاتے ہیں...... پینڈو لوگوں کی طرح...... نہ شیمپو کرواتے ہیں' نہ چہرے کی مالش کرواتے ہیں......نہ ہی کریم لگوا کر روئیں صاف کرواتے ہیں اور نہ بعد میں میک اپ کرواتے ہیں......اب یہ سب کچھ ہو گا میری بھی عزت بے عزتی کا سوال ہے۔"

"میک اپ...... لاحول ولا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"واہ جی واہ......" ہیئر ڈریسر صاحب نے میرے سر میں مالش کے نام سے ایک چپت رسید کی۔ "ٹیلی ویژن پر کرتے ہیں تو ہم سے کروانے میں کیا حرج ہے۔"

"بھئی وہ تو مجبوری ہوتی ہے...... ہلکی سی پفنگ کرواتے ہیں......دوسرے حضرات کی طرح فاؤنڈیشن کی تہیں بٹھا کر اور لپ سٹک تھوپ کر نمودار نہیں ہوتے۔"

"اسی لیے تو دوسرے کمپیئر گورے چٹے اور حسین و جمیل نظر آتے ہیں اور آپ تھکے تھکے اور کالے کالے...... آج مجھ سے میک اپ کروا کے دیکھئے باہر نکلیں گے تو لوگ نچھاور ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہاں سے میک اپ کروا کے نکلوں اور پھر ہیجڑوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگوں تو لوگ تو نچھاور ہوں گے...... خبردار جو مجھے لپ سٹک لگائی تو۔"

ہیئر ڈریسر نے کم از کم میری یہ درخواست قبول کر لی لیکن بقیہ پروگرام پورا کا پورا کیا۔ جب بل پیش ہوا تو وہ میرے پورے سال کی حجامتوں سے بھی زیادہ تھا......البتہ میں پہلے کی نسبت ذرا گورا لگ رہا تھا لیکن گھر پہنچتے پہنچتے پھر سے کالا ہو گیا۔ نہایت عارضی بندوبست تھا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ میک اپ کا رجحان یعنی مردوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ آپ ذرا اندازہ کریں کہ ایک زمانے میں دلہن کا ہار سنگھار گھر میں ہوتا تھا......اب وہ بیوٹی پارلر میں جا کر تیار کی جاتی ہے اور باہر نکلتی ہے تو والدہ صاحبہ سے بھی پہچانی نہیں جاتی...... چلئے یہاں تک تو خیریت تھی لیکن ان دنوں دولہا میاں بھی بیوٹی پارلر میں لے

جائے جاتے ہیں کہ ان کا کچھ کر دیں...... اور وہاں پتا نہیں کیا کرتے ہیں کہ موصوف دمکتے ہوئے باہر آتے ہیں۔ اگرچہ چال میں کچھ نسوانیت آجاتی ہے...... دولہا دلہن ساتھ ساتھ بیٹھے دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ آہا کیا پری ہاتھ آنے کو ہے اور ہائے یہ تو اتنے خوبصورت ہیں...... اصل ٹریجڈی اگلے روز ہوتی ہے، جب دونوں پہلی بار ایک دوسرے کو میک اپ کے بغیر دیکھتے ہیں اور بمشکل اپنے آپ کو چیخیں مارنے سے روکتے ہیں...... بعد میں اکثر دلہن کو روپوش رکھا جاتا ہے اور جو عزیز رشتہ دار اسے دیکھنے آتے ہیں، انہیں صرف فوٹو سیشن کے دوران اترنے والی تصویریں دکھا کر ٹرخا دیا جاتا ہے......

میرے ایک جاننے والے صاحب کے بیٹے جوان ہوئے تو ظاہر ہے انہیں رشتوں کی تلاش ہوئی۔ بیٹے شکل و صورت میں انتہائی پیدل تھے۔ لیکن شرط یہی لگا رکھی تھی کہ جی شادی تب کریں گے اگر لڑکی اتنی خوبصورت ہو کہ دیکھ کر غش پڑ جائے...... اگر کسی لڑکی کی بھی یہی شرط ہوتی تو یہ برخوردار یقیناً اس پر پورے اترتے...... البتہ ایک لڑکے نے برخورداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف یہ گزارش کی کہ لڑکی جیسی بھی ہو اس کی آنکھیں نیلی ہونی چاہئیں...... چنانچہ والد صاحب کی زندگی اجیرن ہو گئی...... راہ چلتی خواتین کی آنکھوں میں جھانکتے، گرلز کالجز کے چکر لگاتے اور کئی بار پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچے کہ باباجی کچھ تو حیا کرو...... اگر کوئی لڑکی پسند آجاتی تو لڑکی کے گھر والے لڑکے کو دیکھنے آتے، جب لڑکا پیش کیا جاتا تو وہ پوچھتے کہ یہ کیا ہے...... انہیں بتایا جاتا کہ یہی تو وہ برخوردار ہے، جس کے لیے آپ کی دختر نیک اختر کا بَر درکار ہے...... اس پر لڑکی والے فوراً اتھلیٹ ہو جاتے اور اولمپک اسٹائل کی دوڑ لگا کر وہاں سے غائب ہو جاتے...... اتنی ناکامیوں کے بعد ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ شام کے اوقات میں فلاں سٹور میں جایا کریں وہاں نہایت تہذیب یافتہ اور معزز خاندان شاپنگ کرنے آتے ہیں اور ان کے ہمراہ ان کی دختران بھی ہوتی ہیں...... بس ان میں سے کسی ایک یا کسی دو کو پسند کر لیجیے...... اور یہ حقیقت تھی کہ وہ صاحب جب اس سٹور میں پہنچے تو حسن و جمال کا دریا بہہ رہا تھا...... ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے، حسن ہی حسن تھا...... چنانچہ انہوں نے دو سگی بہنوں کا انتخاب کر لیا، جو چندے آفتاب اور چندے ماہتاب وغیرہ تھیں۔ کار پر ان کا پیچھا کیا، گھر کا تعین کیا اور اگلے روز صبح سویرے اپنی بیگم کے ہمراہ ان کے ہاں پہنچ گئے...... اپنا مدعا بیان کیا تو حیرت انگیز طور پر وہ لوگ بھی بے حد خوش ہوئے...... اس دوران دونوں لڑکیاں اپنے اپنے بیڈ رومز میں سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئیں...... چونکہ سو کر ابھی ابھی اٹھی تھیں، اس لیے میکبتھ ڈرامے کی

چڑیلوں کی قریبی سہیلیاں لگ رہی تھیں۔ وہ صاحب نہایت رنجیدہ ہوئے اور ان کی بیگم نے بھی ان کے کان میں ڈانٹ ڈپٹ کی کہ تم تو کہتے تھے کہ پریاں ہیں۔ لڑکیوں کے والدین کو بھی صورتحال کا اندازہ ہو گیا اور انہوں نے فوراً اپنی دختران کو کمروں میں واپس بھیجا کہ دفع ہو جاؤ اور تیار ہو کر آؤ...... وہ دفع ہو گئیں اور جب دو گھنٹے کے بعد واپس آئیں تو پھر سے پریاں ہو چکی تھیں۔

یہ نہیں کہ پچھلے زمانوں میں میک اپ کا رواج نہیں تھا...... بالکل تھا، لیکن کم از کم مرد لپ سٹک اور پاؤڈر لگا کر اپنی جنس نہیں بدلتے تھے۔ لڑکیاں بھی اگر بہت کمال کرتی تھیں اور بن ٹھن کر کسی تقریب میں شریک ہونا چاہتی تھیں تو سرمہ ذرا کھینچ کر لگا لیتی تھیں اور اخروٹ کی چھال کا دنداسہ مل لیتی تھیں...... جیسے اس زمانوں میں فلم دیکھنے پر لڑکوں کی گوشمالی کی جاتی تھی اور ان کا کردار مشکوک ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکی ریڈیو پر فلمی گانے سنتی تھی اور اس کے پلّو میں سے لپ سٹک برآمد ہو جاتی تھی تو کہرام مچ جاتا تھا کہ اب اس کا کیا ہو گا...... لوگوں کو علم ہو گیا تو اس کا بیاہ کیسے ہو گا...... یہاں تک کہ اچھے گھرانوں میں شادی کے موقع پر بھی لپ سٹک سے پرہیز کیا جاتا تھا کہ یوں لگتا ہے جیسے لڑکی کسی کا کلیجہ چبا کر آئی ہو...... اور اب یہ صورتحال ہے کہ میری عمر کے لوگ بھی میک اپ کروانے سے گریز کریں تو لوگ باتیں بناتے ہیں کہ کیسا بیک ورڈ شخص ہے لپ سٹک بھی استعمال نہیں کرتا...... اگرچہ ہم لپ سٹک کے ذائقے کو بخوبی جانتے ہیں لیکن یہ بھی پچھلے زمانوں کی بات ہے۔

بس یہی وجہ ہے کہ میں احساس کمتری کا مارا ہوا ایک شخص ہوں۔ میں مرنا تو نہیں چاہتا لیکن کیا کروں لوگ گھیر گھار کر مار دیتے ہیں۔ کبھی ہیرڈز سٹور لنڈن کے قصے سناتے ہیں...... کبھی کاروں کی ہیڈ لائٹ سے مجھے چندھیاتے ہیں، کبھی سپلٹ یونٹ لگوانے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی میک اپ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ویسے مجھے ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ باقی سب لوگ میک اپ میں ہوں، اس ملک کے لیڈر، دانشور اور صنعتکار بھی اور صرف میں ہوں جو اپنا اصلی چہرہ لیے پھرتا ہوں...... یہ تو خطرناک بات ہے ناں...... مجھے بھی اپنا چہرہ چھپا لینا چاہیے...... میک اپ کی دبیز تہوں میں تاکہ نہ کوئی مجھے پہچانے اور نہ کوئی مجھے ذمہ دار ٹھہرائے...... آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆

پانچ سو ڈالر میں ڈاکٹری کا "اعزاز"

اس بار جو معراج پتھر سے ملاقات ہوئی تو اس کے ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ پہلے وہ گفتگو کے دوران خالص لاہوریوں کی طرح "آہو جی" "جی میرے بادشاہ" اور "اوئے جگر" وغیرہ کہہ کر اپنا اظہار کرتا تھا لیکن اب نہایت رنجیدہ اور سنجیدہ شکل بنائے ذرا سا کھانس کر "آہم" کرتا یا "اوہ......" سے اپنی حیرت کا اظہار کرتا۔ چنانچہ میں نے مسکرا کر پوچھا "یار معراج پتھر آج طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... نسبت روڈ کا ہریسہ زیادہ کھا لیا ہے جو یوں قبض شدہ چہرہ بنائے پھرتے ہو؟"

"تم ذرا تمیز سے بات کرو تارڑ صاحب......" اس نے نہایت ناگواری سے کہا "ڈاکٹروں سے اس طرح بات کرتے ہیں۔"

"ڈاکٹر؟ کون ڈاکٹر؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں اور کون...... ڈاکٹر معراج دین...... اور خبردار جو آئندہ مجھے پتھر کہا تو......"

"یار ماجھے...... مذاق کرتے ہو؟"

"کون نامہ نیم کا بچہ مذاق کر رہا ہے...... میرا تم جیسے واجبی پڑھے لکھوں سے مذاق ہو سکتا ہے۔"

میں نے سوچا معراج پتھر کا کچھ پتا نہیں...... پہلے قیمتی پتھروں کا کاروبار کرتا تھا...... پھر ہائیکو شاعر ہو گیا۔ اب شاید کہیں سے ہومیوپیتھک کا ڈپلومہ کر کے ڈاکٹر ہو گیا ہے۔ "اچھا اچھا تو تم بھی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہو گئے ہو۔"

"ناں ناں میں سچل ڈاکٹر ہوں...... ڈاکٹر معراج دین پی ایچ ڈی فرام اولڈ جرسی یونیورسٹی یو ایس اے......"

"اب تو تم واقعی میری ٹانگ کھینچ رہے ہو۔"

"ناں اس عمر میں تمہاری ٹانگ کھینچوں گا تو ہاتھ میں آ جائے گی مجھ پر قتل کا مقدمہ ہو جائے گا۔ کمال ہے غریب آدمی پی ایچ ڈی ہو جائے تو کوئی مانتا ہی نہیں...... تمہارے ادب کے شعبے میں ہر دوسرا بندہ ڈاکٹر ہے...... میں نے کبھی اعتراض کیا ہے۔"

"لیکن تم نے تو پچھلے کئی برسوں سے لاہور سے باہر قدم نہیں رکھا بلکہ نسبت روڈ سے باہر نہیں گئے...... اور امریکہ تو ہرگز نہیں گئے تم...... میں یہ بدتمیزی بھی نہیں کروں گا کہ تم نے تو میٹرک بھی نہیں کیا بلکہ آٹھویں جماعت میں فیل ہو گئے تھے...... تو پی ایچ ڈی کیسے کر لی؟"

"گھر بیٹھ کر...... خط و کتابت کے ذریعے......" اس نے ایک برتری کے احساس سے سینہ پھلا کر مجھ پر ایک نظر حقارت ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیکن یار...... میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب...... تم نے کوئی مقالہ لکھا تھا...... کوئی تھیسس تیار کیا تھا۔"

"یہ سب کچھ تو پرانے زمانے میں ہوا کرتا تھا...... اب دنیا ترقی کر گئی ہے۔ امریکہ والے وہیں امریکہ میں بیٹھ کر اپنے کمپیوٹر سے جان جاتے ہیں کہ وہاں پاکستان میں شہر لاہور کی نسبت روڈ پر ایک جینئس معراج پتھر رہتا ہے جو ہے تو آٹھویں فیل لیکن جس کا دماغ ایسا ہے کہ اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری دینی چاہئے۔ ڈگری دکھاؤں؟"

"دکھاؤ......"

معراج پتھر نے اپنے تھیلے میں سے ایک فریم نکالا اور میرے سامنے کر دیا...... اور واقعی اس میں ایک کاغذ پر سی اولڈ جرسی نجے جے یونیورسٹی امریکہ کا شاندار مونوگرام تھا۔ یہ ڈگری نہایت شاندار کاغذ پر پرنٹ کی گئی تھی اور اس پر درج تھا کہ مسٹر معراج دین کو قیمتی پتھروں کے ریسرچ سکالر کی حیثیت سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جاتی ہے۔ اب میرے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب...... میں نے نیو جرسی کا نام تو سن رکھا ہے لیکن یہ اولڈ جرسی کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم......" معراج پتھر نے لاپروائی سے کہا۔ "لیکن تارڑ صاحب...... اگر نیو جرسی ہو سکتی ہے تو اولڈ جرسی بھی ہو گی...... جیسے ایک شہر یارک ہے تو اب نیویارک ہے۔"

"درست بھئی......" میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور نہایت مغموم ہو گیا۔

معراج پتھر آخر میرا یار تھا اس سے میری یہ حالت دیکھی نہ گئی اور میری کمر پر دھپ مار کر بولا "ہم یاروں کے یار ہیں۔ ہم تمہیں اَن پڑھ اور جاہل نہیں دیکھ سکتے۔ تم بنا شک ہزاروں کتابوں کے مصنف ہو جاؤ پر ڈاکٹر تو نہیں بن سکتے ناں...... تو ہم بنا دیتے ہیں تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

"واقعی معراج پتھر......" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ڈاکٹر معراج دین......" اس نے فوراً کہا۔

"ڈاکٹر معراج دین پی ایچ ڈی فرام اولڈ جرسی جے جے یونیورسٹی...... کیا واقعی!"

"ہاں یار...... تم بھی ڈاکٹریٹ کی امریکی ڈگری حاصل کر سکتے ہو۔"

"لیکن کیسے؟"

معراج پتھر سگریٹ اب بھی اسی سٹائل میں پیتا تھا یعنی انگلیوں کے درمیان میں بھینچ کر اور مٹھی بند کر کے ایک طویل سوٹا لگاتے ہوئے...... پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود "بھئی میرے تو خواب و خیال میں نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک روز مجھ پر اتنا فضل کرے گا کہ میں بیٹھے بٹھائے ڈاکٹر ہو جاؤں گا...... ہوا یہ کہ ایک روز میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ناشتے پر مدعو تھا...... جب وہاں پہنچا تو میں نے یونہی اپنے عزیز سے پوچھا کہ یہ ناشتہ کس خوشی میں ہے تو وہ کہنے لگا کمال ہے تم اخبار نہیں پڑھتے...... اپنے بھائی جان اچھو لوہاری والے نہیں ہیں' جن کی دکان ہے موچی دروازے کے اندر حقے تمباکو کی...... وہ ڈاکٹر ہو گئے ہیں پی ایچ ڈی اور وہ بھی امریکہ سے...... تو اس خوشی میں ناشتہ ہے۔ اب میں نے بھی اخباروں میں پڑھا تھا کہ ہم اہالیان لوہاری دروازہ اپنے قابل فخر فرزند اشرف خان بھٹی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں یا انجمن تاجران موچی دروازہ اشرف خان بھٹی کو مبارکباد پیش کرتی ہے وغیرہ وغیرہ...... لیکن میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ اپنا اچھو لوہاری والا ہو سکتا ہے جو حقے کا تمباکو تھوک و پرچون بیچتا ہے اور دستخط بھی نہیں کر سکتا...... بہرحال جب اچھو آیا ہاروں سے لدا پھندا تو میں اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور حسب معمول اسے دو چار گالیوں سے نواز کر کہا...... اوئے اچھو سچ سچ بتا یہ کیا چکر ہے۔ اچھو کہنے لگا۔ بھا جی کوئی چکر نہیں...... اور اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اسی قسم کی ڈگری جو میں نے تمہیں دکھائی ہے پیش کر دی۔ میں نے اچھو کا بازو مروڑ کر اس کی ایک دو چیخیں نکلوائیں تو کہنے لگا...... بھا جی چھوڑ دیں رب کا واسطہ...... میں بتاتا ہوں...... لیکن آپ وعدہ کریں کہ کسی کو بتائیں گے نہیں۔ چنانچہ میں نے وعدہ کر لیا۔ اس پر اچھو نے بتایا کہ اس کی دکان سے ایک باؤ جی اپنے حقے

کے لیے تمباکو خریدتے ہیں۔ ایک روز کہنے لگے کہ اچھو صاحب تم ساری عمر اَن پڑھ ہی رہو گے تمباکو ہی بیچتے رہو گے...... اگر تم چاہو تو میں تمہیں بالکل سچی ڈگری لے کر دے سکتا ہوں اور وہ بھی امریکہ سے...... صرف پانچ سو ڈالر کا خرچہ ہے...... تم یہ خرچہ کر سکتے ہو تو میں تمہارا نام امریکہ بھیج دیتا ہوں۔ میں نے بھی شغل میلے میں ہاں کر دی۔ لو جی ایک ہفتے کے بعد امریکہ سے کاغذ آ گئے کہ ہم تمہیں حقے کے تمباکو کے ایکسپرٹ کے طور پر ڈاکٹر بناتے ہیں۔ پانچ سو ڈالر بھیج دو۔ میں نے بھیج دیئے تو اس طرح میں ڈاکٹر بن گیا۔"

"لیکن معراج یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہو رہا ہے جناب عالی...... جیسے ہمارے ہاں لوگ دو کمروں میں انٹر نیشنل کالج کھول کر لوگوں میں ڈگریاں بانٹتے ہیں اسی طرح امریکہ میں ہو رہا ہے۔ پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں۔ ڈالر روانہ کرو اور ادھر سے ڈگری آ جاتی ہے۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح ڈاکٹر معراج دین بنا ہوں۔ تم کہو تو تمہارا نام بھی بھیج دوں۔ وہ تمہیں فارم بھیجیں گے تم پُر کر کے روانہ کر دو پانچ سو ڈالر کے ساتھ...... بس اتنی سی بات ہے لیکن کسی اور کو نہ بتانا۔ ہم پاکستانی کریں تو فراڈ ہے لیکن امریکہ والے جو کچھ کریں جائز ہے...... یہاں کس کو پتا ہے کہ یہ اولڈ جرسی جے جے یونیورسٹی کسی امریکی نے اپنے کمرے میں بنا رکھی ہے۔ یہاں تو ڈگری دیکھتے ہیں کہ امریکہ کی ہے اور یقین کر لیتے ہیں۔"

"یار معراج ویسے تو مجھے بھی اس قسم کے خط آتے رہتے ہیں امریکہ اور انگلینڈ سے کہ...... آپ کو آپ کی دانشوری کے باعث "مین آف دی ایئر" منتخب کر لیا گیا ہے یا فلاں "ہوز ہو" میں اس صدی کے سو بہترین لوگوں میں آپ کو شامل کر لیا گیا ہے...... یا پھر آپ فلاں یونیورسٹی کے بورڈ آف گورنرز میں شامل ہو گئے ہیں...... صرف اتنے سو ڈالرز روانہ کر دیجئے...... اور اگر آپ یہ کر دیں تو وہاں سے واقعی سرٹیفکیٹ یا کتاب آ جاتی ہے جس میں آپ جیسے کئی اور بے وقوفوں کے نام ہوتے ہیں...... اور پھر آپ ملک بھر کے اخباروں میں اپنے اس "اعزاز" کے بارے میں خبریں چھپواتے ہیں اور مبارکبادیں وصول کرتے ہیں...... بلکہ ایک بار میں نے بھولے ریڑھی والے کا نام بھی بھیج دیا تھا اور اسے دانشوروں کی عالمی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا...... لیکن یہ پی ایچ ڈی والا سلسلہ میرے علم میں نہ تھا۔"

"یہ سلسلہ بھی بہت عرصے سے چل رہا ہے جناب عالی......"

"یہ تو اپنے آپ کو دھوکہ دینے والی بات ہوئی...... اور دوسروں کو بے وقوف بنانے والی بات ہوئی معراج......"

"بھائی جان دھوکا تو ہم پاکستانی ایک دوسرے کو دیتے ہی رہتے ہیں اور بے وقوف بھی بناتے ہی رہتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں...... لیکن اس سکیم کا ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔ یہ سری لنکا' بھارت اور بنگلہ دیش والے ہم پاکستانیوں کو ہمیشہ طعنے دیتے رہتے ہیں کہ تمہارے ملک میں ہماری نسبت شرح خواندگی بہت کم ہے...... تو فائدہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہر پاکستانی پانچ سو ڈالر جمع کر کے ایسی کسی یونیورسٹی کو بھجوا دے اور فوراً پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لے۔ یوں چند دنوں میں ہماری شرح خواندگی سو فیصد ہو جائے گی اور پاکستان دنیا کا واحد ملک ہوگا' جس کا ہر شہری ڈاکٹر ہوگا...... کیسی تجویز ہے؟"

"بہت اعلیٰ......"

"تو پھر فوری طور پر پانچ سو ڈالر کا بندوبست کرو تاکہ تم ایک ہفتے کے اندر اندر صرف تارڑ سے ڈاکٹر تارڑ پی ایچ ڈی ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر معراج دین تو چلا گیا اور اب میں پانچ سو ڈالر جمع کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں تاکہ پی ایچ ڈی ہو کر ملک و قوم کے وقار میں اضافہ کر سکوں۔ آپ میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

☆☆☆

"گائیڈ برائے بچّہ جات برائے شعبۂ ادب وغیرہ"

پچھلے دنوں پیرو مرشد ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" ایک مرتبہ پھر پڑھی اور حسب معمول بیشمار فیض حاصل کیا۔ مضامین نو کے انبار ذہن میں آنے لگے کہ ان بزرگوں کا یہی فیض ہے کہ ہم جیسے جب ان کی تصنیف پڑھتے ہیں تو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ ذہن کے دریچے کھلتے ہیں اور وہ کچھ سوجھتا ہے' جو پہلے کبھی نہیں سوجھا تھا...... اس کتاب کو پڑھ کر معاً خیال آیا کہ ابن انشاء قدرے آؤٹ ڈیٹڈ ہو گئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں مزید بادشاہوں اور مشیروں وغیرہ کا اضافہ ہو چکا ہے تو کیوں نہ اس کتاب کا ایک ترمیم شدہ ایڈیشن تیار کیا جائے۔ لیکن جب ہاتھ میں قلم لے کر بیٹھے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آپ جانتے ہیں طوطوں کے بغیر لکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ طوطے اسی لیے ہاتھ پر بیٹھے رہتے ہیں تاکہ بیلنس قائم رہے ورنہ ان کے بیٹھنے کا کیا جواز ہے۔ طوطے اڑنے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انشاء جی ایسا ایک فقرہ بھی لکھا نہیں جا رہا تھا لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ حکومتوں اور بادشاہوں کے بارے میں لکھنے کے دوران کچھ سخت مقام آتے تھے۔ انشاء جی کے زمانے میں لوگ مسکرانا جانتے تھے یہاں تک کہ بادشاہ اور حکومتیں بھی خصوصی موقعوں پر تبسم فرما لیتی تھیں اور اس قسم کی تحریروں کو برداشت کر لیتی ہیں لیکن اب صورتحال مختلف ہو چکی ہے اور ہمیں اپنی جان بہت پیاری ہے اس لیے اردو کی آخری کتاب کا ترمیم شدہ ایڈیشن تو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ البتہ اپنی برادری پر تھوڑی سی مشق ناز کر لیتے ہیں۔

مرکزی خیال یہ ہے کہ جونہی بچہ اردو کی آخری کتاب پڑھ لے اس کی رہنمائی کے لیے ایک مختصر گائیڈ بک مہیا کی جائے جسے پڑھ کر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر لے کہ اس کو کس شعبے کو اپنے لیے پسند کرنا ہے۔ شعبے تو بہت سارے ہیں' جن میں شعبۂ حادثات

بھی شامل ہے مگر ہم فی الحال ادب پر ہی اکتفا کرتے ہیں کیونکہ لوگ کسی منصوبہ بندی یا تعلیم سے ادیب نہیں بنتے کسی حادثے کی وجہ سے بن جاتے ہیں اور اس میں چنداں قباحت بھی نہیں۔ آخر سیاستدان بھی تو اسی طرح بنتے ہیں اور کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ مارشل لاء لگواتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ کسی منصوبہ بندی یا تعلیم کو بروئے کار لاتے تو کاہے کو ایسے کارنامے سرانجام دیتے۔ بہرحال ادب میں بھی مختلف اصناف ہیں اور ان میں صرف صنف نازک ہے جو مشترک ہے۔ اس لیے ان کا بیان الگ الگ ہے۔ اب یہ بچے کی مرضی ہے کہ وہ ان میں سے کس صنف کا چناؤ کرتا ہے اور اپنا مستقبل تباہ کر لیتا ہے۔ معاف کیجئے گا روشن کر لیتا ہے تو ملاحظہ کیجئے گائیڈ برائے بچہ جات برائے شعبہ ادب بعد ازاں اردو کی آخری کتاب بنی۔

"نقاد بننا"

بچو نقاد بننا بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ادب کے تمام شعبوں میں ہاتھ پاؤں مار کر بری طرح ناکام ہونے کے بعد ہی نقاد بننا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے لیے چڑچڑا پن اور خشونت بے حد لازمی ہیں جو ادب میں ناکام ہونے کے بعد ویسے ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔ آپ جتنے کم پڑھے لکھے ہوں گے اتنے ہی اچھے نقاد ثابت ہوں گے۔ اگر پڑھ لکھ جائیں گے تو تنقید سے تائب ہو جائیں گے اور کوئی اور بہتر کام کریں گے۔ اسی لیے ناول نگار عبداللہ حسین نے ایک نقاد کے بارے میں کہا تھا کہ اسے تعلیم حاصل کرنی چاہیئے حالانکہ وہ تعلیم حاصل کر لیتا تو نقاد کیسے ہو جاتا۔ اس شعبے میں انسان کو ہر شے میں کیڑے نکالنے کا ماہر ہونا چاہیئے۔ بچو اگر آپ کیڑوں سے ڈرتے ہو تو نقاد نہیں بن سکتے۔ ایک اور نقاد جو ہر بڑے ادیب کے پرخچے اڑانے میں شہرت رکھتے ہیں اور نہایت غصیلے ہیں ان کے بارے میں ان کے ایک عزیز دوست نے کہا تھا کہ ان کو معاف کر دینا چاہیئے کیونکہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ بچپن میں ان کے والد صاحب قبلہ انہیں درخت سے باندھ کر زدوکوب کیا کرتے تھے تو یہ وہی غصہ ہے جو وہ اب ہم عصر ادیبوں پر نکالتے ہیں۔ اس پر ایک ادیب نے کہا تھا کہ ان کے والد واقعی بہت دور اندیش تھے اور جانتے تھے کہ بچہ بڑا ہو کر کیا بنے گا اور جو کرتے تھے درست کرتے تھے اور درخت کے ساتھ باندھتے بھی اسی لیے تھے کہ کہیں بچہ جواب میں ہاتھ نہ اٹھا لے۔ بڑے ہو کر انہوں نے یہی ہاتھ ادیبوں پر اٹھا کر حساب برابر کر دیا۔ اس سے خدانخواستہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نقاد بننے کے لیے والد صاحب سے اس قسم کی درگت بنوانا ضروری ہے۔ یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ بہت سے لوگ بچپن میں زدوکوب ہوئے بغیر نقاد بن گئے۔ اگرچہ وہ اتنے کامیاب نہ تھے۔ نقاد بننے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ پر کوئی تنقید نہیں

کر سکتا۔ ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ کوئی آپ کی عزت بھی نہیں کرتا۔ یوں بھی جس نقاد کی ادیب عزت کرتے ہیں وہ گمنام ہی رہتا ہے۔

"افسانہ نگار بننا"

یہ قدرے آسان کام ہے کیونکہ راجندر سنگھ بیدی نے کہا تھا کہ قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ قدم ذرا دھیان سے اٹھانا ہے کہیں کوئی بکھری ہوئی کہانی اس کے نیچے آجانے سے زخمی نہ ہو جائے۔ بس آپ قدم اٹھاتے جائیے اور کہانیاں اٹھاتے جائیے۔ انشاء اللہ صرف ایک دن کی چہل قدمی سے ہزاروں کہانیاں جمع ہو جائیں گی۔ ان سب کو چھپوا دیجئے اور افسانہ نگار کہلائیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کہانیاں قدموں میں بکھری تو ہوتی ہیں لیکن انہیں اٹھا کر لکھنا بھی پڑتا ہے۔ یہ محض خیال خام ہے کہ بے شمار افسانہ نگار ہیں جو لکھنا نہیں جانتے لیکن بام شہرت کی بلندیوں پر ہیں۔ بہرحال اگر مجبوری ہو تو انہیں کسی سے لکھوایا بھی جا سکتا ہے۔ جیسے پاک ٹی ہاؤس کا ایک نہایت شریف النفس ویٹر شریف پہلے اچھا بھلا تھا' پھر شاعروں اور ادیبوں کی صحبت میں خراب ہو گیا اور خود بھی شعر کہنے لگا۔ وہ اکثر چائے کے برتن میز پر رکھنے کے بعد جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اور کہتا' صاحب یہ ذرا دیکھ لیں' ٹھیک ہے ناں۔ اور کاغذ پر کوئی نظم یا غزل لکھی ہوتی اور بیشتر شاعروں سے بہتر ہوتی' اور آپ پوچھتے۔ شریف یہ تم نے لکھی ہے؟ تو وہ کہتا' نہیں جی میں نے نہیں لکھی لیکن یہ ہے میری۔ اس پر آپ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا اور آپ کہتے شریف اگر یہ غزل تمہاری ہے تو تم نے ہی لکھی ہے ناں۔ وہ سر ہلا کر جواب دیتا۔ جناب مجھے تو لکھنا نہیں آتا جب کوئی غزل بناتا ہوں تو زاہد ڈار صاحب سے کہتا ہوں کہ میں بولتا ہوں آپ لکھ دیں۔ تو یہ لکھی ہوئی میری نہیں پر ہے میری۔ پس یہ ثابت ہو گیا کہ افسانہ نگار بننے کے لیے بھی آپ کا لکھا پڑھا ہونا بالکل ضروری نہیں۔ آپ کسی اور سے لکھوا سکتے ہیں۔ آپ کا کام صرف قدموں میں بکھری کہانیاں جمع کرنا ہے۔

"سفر نامہ نگار بننا"

ادب کا یہ شعبہ ان دنوں بڑا پاپولر ہے۔ پہلے زمانے میں یہ مشکل کام تھا کیونکہ اس کے لیے سفر بھی کرنا پڑتا تھا۔ اب گائیڈ بکس' انٹرنیٹ اور جغرافیئے کی کتابوں کی مدد سے اس پر مکمل عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہم عصر سفر نامہ نگاروں کی کتابوں میں سے من پسند ٹکڑے اڑا کر اپنے سفر نامے میں بھی بخوبی ٹانکے جا سکتے ہیں۔ اسے سفری توارد کہتے ہیں۔ آج کل یوں بھی پرانے گانوں کو ری مکس کرنے کا رواج ہے تو آپ کسی بھی سفر نامے کو ری مکس کر کے

اپنے نام سے چھپوا سکتے ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ "چن کِھناں" کو بھٹی صاحب نے گایا تو انہیں کون جانتا تھا' شازیہ منظور نے اسے ذرا ماڈرن انداز میں پیش کیا تو اسے ہر کوئی جانتا ہے۔ یوں آپ دوسرے سفر نامہ نگاروں کی نقل کر کے ان پر دراصل احسان کرتے ہیں۔ اگرچہ فی الحال آپ بچے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی تو آپ بڑے ہوں گے اس لیے آپ سے عشق و محبت وغیرہ کے بارے میں بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سفر نامے میں لڑکیوں کا ہونا اشد ضروری ہے۔ ہر دوسرے صفحے پر ایک لڑکی کا نمودار ہونا لازمی ہے اور وہ آپ پر لٹو ہو جاتی ہے اور آپ نہیں ہوتے۔ یعنی لٹوّ۔ پھر آپ اسے روتا دھوتا چھوڑ کر اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سفر نامہ نگار اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ وہ اس لیے نہیں کرتا کہ ایک تو وہ قبیلہ کفار سے تعلق رکھتی ہے اور سفر نامہ نگار اللہ کے فضل سے مسلمان ہے اور اگر وہ شادی کر لے تو اس سے اگلے باب میں لڑکی کہاں سے آئے گی۔

سفر ناموں کی ایک قسم "پلاؤ سفر نامہ" بھی بے حد مقبول اور منافع بخش ہے۔ اس میں سفر نامہ کسی مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے بالٹی مور جاتا ہے۔ شنید ہے کہ یہ شہر امریکہ میں واقع ہے۔ اگرچہ اس کے نام میں بالٹی آتا ہے' جس میں ہمارے ہاں پانی بھرتے ہیں۔ ویسے شاعر بھی وہاں پانی بھرنے ہی جاتا ہے اور پھر واپسی پر اپنے سفر نامے میں ان تمام کھانوں کی تفصیل لکھتا ہے' جو اس نے مفت میں کھائے اور جتنے لوگوں سے ملتا ہے ان سب کے نام اور بال بچوں کی نیکروں وغیرہ کی تعداد لکھتا ہے اور انہیں بالٹی مور کا سب سے بڑا شاعر اور وہاں اردو کی شمع جلائے رکھنے والا مشعلچی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ان سینکڑوں لوگوں میں سے کوئی ایک جُغدا اسے پھر امریکہ کا ٹکٹ روانہ کر دیتا ہے' کیونکہ اس کے بیٹے کے ختنوں کے موقع پر ایک مشاعرہ برپا کیا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ بچو آپ نے اپنے ملک کے بارے میں کوئی سفر نامہ نہیں لکھنا' کیونکہ ایک تو اس میں لڑکیاں نہیں ڈالی جا سکتیں اور دوسرے یہ کہ حاسد لوگ چیک کر لیتے ہیں کہ یہ وہاں گیا بھی ہے یا نہیں۔ ادب میں دیگر اصناف کی طرح سفر نامے میں بھی مشہور ہونے کے لیے آپ کو ڈفلیاں بجانے والے درکار ہوں گے۔ یہ آپ کو ہر جگہ سے مل جاتے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ بجانے والے تو مل جاتے ہیں لیکن ڈفلیاں نہیں ملتیں کیونکہ آؤٹ ڈیٹڈ ساز ہے۔ ان کی جگہ ڈھول زیادہ مناسب رہے گا اور اگر بہت ماڈرن ہونا چاہتے ہیں تو گٹار بجانے والے لے آئیے اور اپنی شان میں پاپ کنسرٹ کا اہتمام کروا لیجئے۔ سفر نامہ نگاری کے بارے میں ہی کہا گیا کہ یہ کاٹھ کی ہنڈیا ہے ایک بار ہی چڑھتی ہے آپ کاٹھ کی ہنڈیا کے بجائے پریشر ککر استعمال کیجئے یہ بار بار چڑھے گا۔ ذاتی تجربہ ہے!

انشائیہ نگار ہو جانا۔

بچو آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے دیگر اصناف کے ساتھ تو کچھ اور لکھا ہے لیکن انشائیہ کے ساتھ کچھ اور ہی لکھا ہے۔ یعنی نقاد بننا' افسانہ نگار بننا اور سفر نامہ نگار بننا لیکن انشائیہ نگار ہو جانا لکھا ہے اس لیے کہ انشائیہ نگار بننا ممکن ہی نہیں۔ آپ یا تو انشائیہ نگار ہو جاتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اکثر خبر آتی ہے کہ فلاں صاحب چنگے بھلے تھے پھر کیا دیکھتے ہیں کہ انشائیہ نگار ہو گئے ہیں۔ ہر طرف ماتم بپا ہو جاتا ہے۔ لوگ تعزیت کے لیے آنے لگتے ہیں لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت وغیرہ۔ یہ واحد صنف ہے جس کے بارے میں ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ یہ کیا ہے بعض لوگ اسے تیسری صنف بھی قرار دیتے ہیں کچھ کہتے ہیں اس میں مزاح اور طنز جائز ہیں اور کچھ اسے حرام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ادب کی سب سے اعلیٰ صنف ہے اور اس میں چیزوں کے بطون میں داخل ہو کر دیکھا جاتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے اور پھر باہر آ کر رپورٹ دی جاتی ہے کہ پردے کے پیچھے یہ کیا ہو رہا ہے۔

ایک بہترین انشائیے کی یہ پہچان ہوتی ہے کہ اس کے ہر فقرے کے ساتھ ایک جمائی آتی ہے اور انسان اپنے آپ کو کوستا ہے اور بال نوچتا ہے کہ میں نے اسے کیوں پڑھنا شروع کر دیا۔ اگر دو تین فقرے گزر جائیں اور جمائی نہ آئے تو سمجھ لیجئے یہ انشائیہ نہیں کچھ اور ہے۔ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ موضوع کی کوئی قید نہیں۔ آپ کسی بھی شے پر انشائیہ قلمبند کر سکتے ہیں مثلاً استرا' ازار بند' کموڈ' بینک اکاؤنٹ کھولنا' بے عزت ہونا وغیرہ۔ گلہری پر بھی انشائیہ لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ گلہری مائنڈ نہ کر جائے کہ میں اب اتنی گئی گزری بھی نہیں کہ مجھ پر انشائیہ لکھا جائے۔ کچھ حاسد نقادوں کا خیال ہے کہ یہ سیدھا سادا وہ جواب مضمون ہوتا ہے جو ہم پانچویں جماعت میں لکھا کرتے تھے جب کہ بیشتر حاسد نقادوں کو یقین ہے کہ نہیں جواب مضمون اس سے تو بہتر ہوتا ہے۔

تو جو بچے اردو کی آخری کتاب سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں یہ ان کے لیے ایک مختصر سی گائیڈ بک تھی۔ اگر اس پر عمل کرنے سے کوئی بچہ ادیب بن گیا تو میں سمجھوں گا میری ساری محنت اکارت گئی۔

☆☆☆☆

"ٹُوٹ بُٹوٹ اور ہائیکو......!"

پیارے قارئین! پچھلے کالم میں میں نے ان بچوں کے لیے ایک گائیڈ بک ترتیب دی تھی جو ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" پڑھ کر حال ہی میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ فارغ التحصیل کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مقامی تحصیل میں آپ پر کوئی مقدمہ چل رہا تھا اور اب جا کر آپ اس سے فارغ ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو اس کا مطلب نہیں آتا تو کسی اور سے پوچھ لیجئے کیونکہ مجھے بھی نہیں آتا...... چنانچہ یہ فارغ التحصیل بچے اگر ادیب بننا چاہتے ہیں تو میں نے کچھ مشورے دیئے تھے۔ لیکن بجائے شکرگزار ہونے کے یہ بچے مجھ پر ہی برس پڑے کہ انکل آپ نے افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بننے کے گُر تو بتا دیئے لیکن کالم نگار' ناول نگار اور خاص طور پر شاعر کیسے بنا جاتا ہے' اس کے بارے میں چپ سادھ لی حالانکہ فی زمانہ ان شعبوں کی اہمیت سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ہمارے عہد کے بچے اتنے چالاک ہوگئے ہیں۔ چنانچہ میں بچوں کی پُرزور فرمائش پر ان شعبوں کی طرف بھی رجوع کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اگلے چند ماہ میں اس ادبی گائیڈ پر عمل کرتے ہوئے بیشمار نئے کالم نگار' ناول نگار اور شاعر وجود میں آجائیں گے۔ وجود میں آکر کیا کریں گے اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

"کالم نگار بننا"

اس شعبے میں بھی کمال حاصل کرنے کے لیے کسی خاص تربیت یا سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف حوصلے کی ضرورت ہے' جو اس اخبار کے مالک میں ہونا چاہیئے جو آپ کی انٹ شنٹ تحریریں مسلسل چھاپتا رہے تا آنکہ آپ ایک کالم نگار کی حیثیت سے

مستحکم نہ ہو جائیں اور جب آپ مستحکم ہو جائیں گے تو پھر آپ کی چاندی ہو جائے گی...... اور اگر آپ سیاسی کالم لکھتے ہیں تو پھر آپ کا سونا ہو جائے گا...... کیسے ہو جائے گا یہ میں تھوڑی دیر کے بعد عرض کروں گا۔ لیکن سب سے پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ کس قسم کے کالم نگار بننا پسند کریں گے۔ اگر آپ اس قسم کے کالم نگار بننا چاہتے ہیں' جس قسم کا میں ہوں تو اپنے آپ کو برباد اور قارئین کو پریشان کرنے کے بجائے ابھی سے توبہ تائب ہو جائیں۔ ویسے ایک قسم تو مزاحیہ کالموں کی ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں پڑھ کر رونا آتا ہے اور بال نوچنے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی رونا اپنے آپ کو آتا ہے اور بال کالم نگار کے نوچنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لیے اکثر مزاحیہ کالم نگار فارغ البال ہوتے ہیں۔

مزاحیہ کالم نگار اگر شاعر بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ ایک اور قسم "زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے" ہوتی ہے' جس میں کالم نگار ہمیشہ شکوے ہی کرتا رہتا ہے۔ رونے دھونے میں مصروف رہتا ہے۔ پرانے وقتوں اور بزرگوں کو یاد کر کے آہیں بھرتا رہتا ہے۔ اسے موجودہ زندگی میں کوئی خوبصورتی کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور ہمیشہ کالم کا اختتام اس فقرے پر کرتا ہے کہ میں قارئین کو اپنا آخری سلام پیش کرتا ہوں۔ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوگئی ہو تو معاف فرمایئے گا' کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ شاید زندگی وفا نہ کرے اور کل آپ میرے قل شریف میں شریک ہو رہے ہوں۔ یہ فقرے وہ پچھلے تیس برسوں سے لکھ رہا ہے اور قل کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس قسم کے کالم لکھنے کے لیے آپ کو دو تین گانوں کی اشد ضرورت ہوگی' جنہیں سن کر آپ کا موڈ بنے گا۔ پہلا گانا "میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں" آپ کو اشکبار کر دے گا اور دوسرا گانا "محبت کا جنازہ جا رہا ہے" سنتے ہی آپ کی جان نکلنی شروع ہو جائے گی اور بس یہی وہ وقت ہے جب قلم ہاتھ میں لے کر آپ اپنے آنسو اور ناک پونچھتے ہوئے کالم لکھنا شروع کر دیں گے۔ کالموں کی ایک اور منافع بخش قسم حب الوطنی اور دردمندی کے کالم ہوتے ہیں۔ ان میں آپ مختلف حوالے دے کر صرف اپنے آپ کو محبّ الوطن ثابت کرتے ہیں اور دوسروں کے رزق کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ فلاں شخص کو نوکری سے نکال دیا جائے اور فلاں ادیب کو گولی مار دی جائے اور فلاں شاعر کو فلاں شعر کہنے پر درّے لگائے جائیں۔ اپنے آپ کو پرہیزگار ثابت کرتے ہیں اور رات کے کھانے سے پیشتر پانی نہیں پیتے اور سب کچھ پیتے ہیں۔ کوئی بھی پارٹی جس کے جیتنے کا امکان ہو'

اس کے سر براہ یا سر براہی کی معجزانہ قیادت کو اس ملک پر براہ راست اللہ کی عنایت سمجھتے ہیں۔ کالم لکھنے سے پہلے اس سر براہ یا سر براہی سے پوچھ لیتے ہیں کہ کل کے کالم کے لیے کیا حکم ہے۔ پارٹی کے اقتدار میں آتے ہی حاضر ہو جاتے ہیں اور اپنی چند معصوم سی خواہشیں پیش کر دیتے ہیں اور حسب منشاء ملکی و غیر ملکی عہدے پاتے ہیں۔ ان عہدوں کے دوران قلم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے اور جب خیر سے اپنی آنے والی تھاں پر آتے ہیں تو نہایت آبدیدہ ہو کر قارئین سے مخاطب ہوتے ہیں۔ انہیں بھی رلاتے ہیں اور آپ بھی روتے ہیں کہ پل بھر میں یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ ایک اور قسم ''لطیفہ کالم'' کہلاتی ہے' جس میں لطیفے زیادہ ہوتے ہیں اور کالم کم...... صاحبان اقتدار ان لطیفوں کو بے حد پسند کرتے ہیں' کیونکہ لطیفوں کے علاوہ کوئی اور سنجیدہ بات ان کے پلّے نہیں پڑتی۔ بجواب آپ نے خود فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کس قسم کے کالم نگار بننا چاہتے ہیں۔

''شاعر بن جانا......''

شاعر ہونا سخت بے عزتی کی بات ہے۔ اسی لیے تو غالب نے کہا تھا کہ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غالب نے یہ آج کل کے شاعروں کے بارے میں کہا تھا' کیونکہ ان کا ذریعۂ عزت کچھ اور ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ لفافہ ہوتا ہے جو ہر مشاعرے کے بعد وہ زبردستی وصول کرتے ہیں۔ لیکن ان دنوں سب سے بڑا ذریعۂ عزت غیر ممالک میں شاعرات کی دریافت ہے۔ پہلے ان کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جاتا ہے' پھر انہیں دریافت کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ بے حد مصروف ہوتی ہیں اس لیے انہیں شعر لکھ کر دے دیئے جاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات شعری مجموعہ چھپوا کر انہیں پاکستان بلا کر ان کے اعزاز میں منعقدہ ادبی تقریب میں ان کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال ہم ذرا موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ کو ہم نے گائیڈ کرنا ہے کہ شاعر کیسے بنا جاتا ہے چونکہ آپ ابھی چھوٹے ہیں اس لیے آپ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر اس طرح بنتے ہیں کہ بال بڑھا لیتے ہیں' ان میں جوئیں پیدا کر لیتے ہیں اور پھر سگریٹ پیتے ہیں اور پتا نہیں کیا کیا پیتے ہیں۔ یہ کام صرف بڑے کرتے ہیں' آپ جب بڑے ہوں گے تو کر لیجئے گا۔ فی الحال چھوٹے ہی رہیئے...... جیسے ادیب بننے کا شارٹ کٹ' سفر نامہ نگاری ہے ایسے شاعر بننے کا آسان ترین نسخہ ہائیکو نگاری ہے۔ یہ ایک جاپانی صنف ہے لیکن جاپان کی نسبت پاکستان میں زیادہ رائج ہے۔ بلکہ جب سے پاکستان میں رائج ہوئی ہے جاپانیوں نے اس سے توبہ کر لی ہے۔ اب پاکستانی شاعر جاپانیوں کو

پکڑ پکڑ کر ہائیکو سناتے ہیں اور وہ اس دن کو کوستے ہیں جب انہوں نے ہائیکو ایجاد کی تھی۔ بچوں کے لیے یہ بے حد مناسب صنف ہے کیونکہ فی الحال صنف نازک ان کے لیے نامناسب ہے مثلاً وہ اماں جان کی گود میں بیٹھے بیٹھے ہائیکو کہہ سکتے ہیں۔

ـ اماں سے دودھ مانگا......
ایک تھپڑ......
میرے رخسار لال......

ـ توے پر روٹی......
ذرا سے گھی سے......
پراٹھا بن سکتی ہے!

ـ چندا ماموں آئے......
پھر اصلی ماموں آئے......
دونوں میں فرق!

ـ ممی لوری دیتی ہے......
نندیا آ...... منے کو لے جا
مجھے پارٹی پر جانا ہے......

مندرجہ بالا مثالوں سے ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ بچے کم عمری کے باوجود اپنے ذاتی تجربوں کو ہائیکو میں ڈھال سکتے ہیں اور فوری طور پر شاعر بن سکتے ہیں۔ یقین نہیں آتا تو آج کل کے ادبی پرچوں میں شائع ہونے والی ہائیکوز پڑھ لیجئے' یقین آ جائے گا۔ پچھلے زمانوں میں بچوں کے لیے ٹوٹ بٹوٹ قسم کی شاعری کی جاتی تھی۔ اب ہائیکو کی جاتی ہے' جس کے مقابلے میں ٹوٹ بٹوٹ بڑوں کی شاعری لگتی ہے۔ اگر آپ ہائیکو کہنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں تو ٹیلی ویژن کے گیت نگار بن جائیے۔ آغاز میں اپنے گیتوں کی فوٹو سٹیٹ بنوا کر ٹیلی ویژن سٹیشن کے گیٹ کے باہر کھڑے ہو جائیے اور جو بھی پروڈیوسر یا گلوکار اندر جائے اسے ''اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا'' کہہ کر گیت کی کاپی

تھما دیجیے۔ کوئی نہ کوئی دن ایسا آئے گا جب کسی ایمرجنسی میں آپ کا گیت استعمال ہو جائے گا اور آپ ممتاز گیت نگار ہو جائیں گے اور اب ٹیلی ویژن کے اندر جا کر وہی کام کریں گے جو آپ گیٹ پر کھڑے ہو کر کرتے تھے یعنی اللہ ہی دے گا...... اپنی بیاض اور گیتوں کی کاپیاں ہمیشہ جیب میں رکھیے اور ہر پروگرام میں اگلی نشستوں پر جا کر زبردستی بیٹھ جائیے اور پھر گلوکار کی جانب اس وقت تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہیے جب تک کہ وہ نروس ہو کر آپ سے کسی گیت کی فرمائش نہ کر دے۔ اب آپ یعنی بچے کہیں گے کہ یہاں تک تو درست ہے لیکن ٹیلی ویژن کا گیت لکھا کیسے جاتا ہے تو اس کی ترکیب بے حد آسان ہے۔ آپ کو صرف ''ہو جی ہو'' لکھنا آنا چاہیے۔ کوئی سے بھی دو فقرے لکھ کر ان کے آخر میں ''ہو جی ہو'' لکھ دیں مثلاً:

بہار ہے تو پیار ہے
پیار ہے بہار ہے...... ہو جی ہو
کلیوں پہ نکھار ہے
جیا بے قرار ہے...... ہو جی ہو

اگر آپ ماڈرن گیت لکھنا چاہتے ہیں تو یہاں ''ہو جی ہو'' کے بجائے ''ڈم ڈما ڈم۔ ڈم'' کا اضافہ کر دیں:

اوئے چن میرے طوطیا
طوطیا من موتیا...... ڈم ڈما ڈم۔ ڈم!
اوئے چن میرے باندرا
باندر دا مہاندرا...... ڈم ڈما ڈم۔ ڈم!

''ناول نگاری''

بچو! یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے ہم دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ خواتین کے پسندیدہ ناولوں سے آغاز کریں۔ ایسا ناول لکھنے کے لیے تین چیزیں درکار ہیں۔ کاغذ، قلم اور ہیروئن کا کوئی نہایت رومانوی اور بے ہودہ سا نام مثلاً انسانا...... کریانہ...... کچورا...... شرمانہ وغیرہ...... باقی ایسے ناول کو آپ کہیں سے بھی شروع کر سکتے ہیں اور جب کاغذ ختم ہو جائیں تو کہیں بھی ختم کر سکتے ہیں اس کی کوالٹی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

''ادبی اخبار نکالنا''

یہ ادب کی تازہ ترین اور نہایت منافع بخش صنف ہے۔ اس میں ممتاز ادیبوں اور عظیم شاعروں کے انٹرویو اور تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔ ڈسپلن کے اتنے پابند ہوتے ہیں کہ تصویر کے سائز اور ہیڈ لائن کی لمبائی کے مطابق ہدیہ لیتے ہیں نہ کم نہ زیادہ...... اور ادیب ہونا بھی شرط نہیں ہوتا۔ البتہ اعزازی ایڈیٹر آہستہ آہستہ ادیب یا شاعر ہو جاتا ہے اور اس کے اعزاز میں محافل برپا کی جاتی ہیں، کیونکہ وہ اعزازی ہوتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ وہ تو ادیب یا شاعر ایسٹیبلش ہو گیا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی کوئی کتاب چھپوانے کے بجائے اپنے فن کے بارے میں لکھے گئے مقالات کا مجموعہ چھپوا دیتا ہے اور شہرت دوام حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ جو بچہ بالکل ہی پھسڈی ہو وہ ادبی اخبار نکال لے۔ آزمائش شرط ہے اور ڈم ڈما ڈم...... ڈم!



"بیل گاڑیوں والوں کے پاس موٹر گاڑیاں"

خان قربان سے میری بحث ہو گئی۔

بحث کرنے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا بس یونہی ہو گئی۔

میں نے صرف اتنا کہا کہ یار قربان آج کل شریف آدمی کی پہچان نہیں رہی......

کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ جو صاحب ہیں یہ کوئی شریف آدمی ہیں یا ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آئے ہیں اور اگلے چندروز میں پھر وہیں قیام پذیر ہوں گے...... کچھ پتا نہیں چلتا۔

قربان کہنے لگا۔ "میاں پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم شریف آدمی کو پہچاننا چاہتے ہو یا ایک معزز آدمی کو؟"

میں نے کہا۔ "ایک ہی بات ہے۔"

کہنے لگے "نہ' شریف آدمی اور ہوتا ہے اور معزز آدمی اور ہوتا ہے...... بہر حال انہیں بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے...... پوچھو کیسے؟"

میں نے پوچھا کہ کیسے؟

"سونگھ کر......" وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

"سونگھ کر؟" میں پریشان ہو گیا۔ "یار قربان سونگھنے سنگھانے کا کام تو جانور کرتے ہیں جب وہ بے چین ہوتے ہیں...... کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص ایک پارٹی میں جائے اور باری باری سب حضرات کو پہلے سونگھے اور پھر فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون صاحب شریف ہیں......"

"بھائی انسان بھی تو آہستہ آہستہ جانوروں کے قریب آ رہے ہیں...... سو بچوں کو قتل کر کے مسکراتے ہوئے تصویریں اترواتے ہیں...... کروڑوں ڈالر ہضم کر کے عدالت

میں تاریخ بھگتنے آتے ہیں تو دانت نکال کر "وی" یعنی وکٹری کا نشان بناتے ہیں...... تو اگر ہم ان کی فائدہ مند عادات اپنا لیں تو کیا حرج ہے...... یقین کرو کہ آج کل صرف سونگھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے کہ یہ انسان معزز ہے یا نہیں......"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے نہایت بڑھیا قسم کا سینٹ لگایا ہو گا...... اگر معزز نہیں ہے تو عطر چنبیلی یا گلاب کی بوتل چھڑکی ہو گی؟"

"نہیں یار قربان...... یہ تو معزز ہونے کی پرانی علامات ہیں۔ اگر تم ایک شخص کے قریب جا کر اسے سونگھو اور اس کے لباس میں سے پٹرول کی بو آ رہی ہو تو وہ معزز ہو گا......"

"وہ تو تمام پٹرول پمپ مالکان اور کارندوں سے بھی آتی ہے۔"

"بھائی میں بحث کرنے نہیں آیا ایک عقل کی بات بتا رہا ہوں۔ کسی شادی بیاہ میں کسی فنکشن میں جاؤ تو جس شخص کے کپڑوں سے پٹرول کی لپٹیں اٹھ رہی ہوں سمجھ لو کہ وہ ایک معزز اور متمول شخص ہے ورنہ اچھی گاڑی تو ہر ایک کے پاس ہوتی ہے بلکہ میری بیگم کا کہنا ہے کہ جن کے پاس بیل گاڑیاں تھیں' اب ان کے پاس موٹر گاڑیاں آ گئی ہیں اسی لیے وہ ان کو بیل گاڑیوں کی طرح ہی چلاتے ہیں۔"

"میں بھی بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن خدارا یہ تو بتادو کہ پٹرول کی بو اس کے لباس سے کیوں آئے گی اور اس کا معزز ہونے سے کیا تعلق ہے؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم اپنے کپڑے کس سے دھلواتے ہو؟"

"شریفاں بی بی سے......"

"ہیں...... یہ کون ہیں؟"

"بھئی ایک زمانے میں والدہ صاحبہ دھوتی تھیں۔ پھر بیگم صاحبہ نے زدوکوب کرنا شروع کر دیا یعنی کپڑوں کو...... اور اب اس میں سکت نہیں رہی تو ایک مائی شریفاں بی بی آتی ہے اور خوب ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر کپڑوں کو ادھ موا کر دیتی ہے۔"

"اسی لیے......" خان قربان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نہ کبھی معزز رہے ہو نہ اب ہو اور آئندہ کوئی امکان ہے...... اسی لیے یہ بات نہیں سمجھ رہے کہ جس شخص کے لباس سے پٹرول کی مہک آتی ہے وہ کیوں معزز ہوتا ہے۔"

"تم بتا کیوں نہیں دیتے؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"بھائی کپڑے گھر میں دھونے کا نظام تو کب کا فرسودہ ہو چکا...... پھر یہ دھوبی لوگ آئے اور اب یہ ہے کہ معزز حضرات اپنے تمام کپڑے ڈرائی کلین کرواتے ہیں...... اور اسی

لیے ان سے پٹرول کی بو آتی ہے...... اور ڈرائی کلین بھی شہر کے فائیو سٹار ہوٹلوں کی لانڈریوں سے کرواتے ہیں...... تم اب اور کسی کو نہ بتانا کہ تمہارے کپڑے شریفاں بی بی دھوتی ہے' بے عزتی کی بات ہے۔"

"لیکن یار قربان ہمارے زمانے میں تو صرف اونی کپڑے ڈرائی کلین کروائے جاتے تھے اور وہ بھی دو چار سال کے بعد...... عام سوتی ملبوسات تو گھروں میں ہی دھوئے جاتے تھے یا پھر عید بقر عید کا موقع ہوا تو دھوبی سے دھلوا لیے...... مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سردیوں میں شرفاء اوور کوٹ بھی زیب تن کرتے تھے' جسے چیسٹر کہا جاتا تھا...... یہ ہمیشہ بے حد دبیز اور بھاری ہوا کرتا تھا...... بلکہ ہم بچوں کے درمیان مقابلہ ہوا کرتا تھا...... کسی بچے کو دیگر تمام بچے بڑی مشکل سے وہ چیسٹر پہنا دیا کرتے تھے...... پہلے تو وہ بچہ اس کے بوجھ سے بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے بہت زور لگا کر کھڑا کیا جاتا تھا...... بچہ پھر ڈھیر ہو جاتا تھا اور بالآخر جب وہ کھڑا ہو جاتا تھا تو گھڑی پر وقت دیکھ کر چیک کیا جاتا تھا کہ یہ پھر سے دھڑام سے گرنے تک کتنی دیر قائم رہا ہے...... تو جو بچہ زیادہ دیر کھڑا رہتا تھا وہ یہ مقابلہ جیت جاتا تھا تو چیسٹر بھی دو چار سال بعد سب لوگ اٹھا کر ڈرائی کلین شاپ پر لے جایا کرتے تھے...... بلکہ ایک بار ہم اس ڈرائی کلین شاپ کے پچھواڑے میں چلے گئے تو وہاں ان کے ملازمین اونی سوٹ اور اوور کوٹ ڈنڈوں سے کوٹ کوٹ کر پانی میں دھو رہے تھے...... ہم نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ڈرائی کلین کر رہے ہیں...... بعد میں ان پر پٹرول کے چند قطرے چھڑک کے جائیں گے......"

خان قربان نے ایک طویل جمائی لی۔ "یار یہ کیا بزرگوں کی طرح پچھلے زمانوں کے بوسیدہ قصے سنا رہے ہو...... دوست کی حیثیت سے میرا کام تھا تمہیں بتانا کہ ایک معزز شخص کی پہچان کیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام...... اور ہاں خدا کے لیے کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم مائی شریفاں بی بی کے ہاتھوں کے دھوئے ہوئے کپڑے پہنتے ہو...... تمہاری تو عزت ہے نہیں' میری بھی سخت سبکی ہو گی کہ اس کے ایسے دوست ہیں جو کپڑوں کو ڈرائی کلین بھی نہیں کروا سکتے۔"

میں گھر واپس آیا تو سخت "اپ سیٹ" تھا اور میرا موڈ آف ہو چکا تھا۔

"بیگم......" میں باورچی خانے میں جا کر دھاڑا "تمہیں پتا ہے کہ میں آج تک ایک اچھا ادیب کیوں نہیں بن سکا؟"

"تم میں کوئی عقل مت ہوتی تو بنتے...... تم میں ٹیلنٹ ہی نہیں ہے۔ ذرا یہ

ادرک تو کاٹ دو اس کے بغیر گو بھی گوشت میں ذائقہ نہیں آتا۔"

"اچھا یا بڑا ادیب بننے کے لیے ٹیلنٹ کی ضرورت نہیں ہوتی...... بہر حال تمہیں پتا ہے کہ میں معزز کیوں نہیں ہو سکا۔"

"کیوں؟" اس نے تنگ آ کر کہا اور ڈوئی اٹھا کر ایک ایسے زاویے پر معلق کر دی جو نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"اس لیے کہ تم مجھے مائی شریفاں کے دھلے ہوئے کپڑے پہناتی ہو...... جو انہیں ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر ان کا کچومر سلاد بنا دیتی ہے۔"

بیگم کی ڈوئی کا زاویہ ذرا سا بدلا اور یوں محسوس ہوا جیسے اس کا نشانہ میرا سر ہو سکتا ہے...... اور مجھے تجربہ ہے کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ "ساری عمر تو تم اسی قسم کے کپڑے پہنتے رہے ہو تو اب تمہیں کیا تکلیف ہو گئی ہے؟"

"میں تو لاعلمی میں مارا گیا بیگم۔" میں فوراً دھاڑنے سے تائب ہوا اور بھیگی بلی بن گیا...... اور بلی بھی وہ جسے سردیوں میں بھگو کر اس کے اوپر پنکھا چلا دیا جائے۔ "مجھے تو آج ہی خان قربان نے بتایا ہے کہ معزز ہونے کے لیے کپڑے ڈرائی کلین کروائے جاتے ہیں اور وہ بھی کسی فائیو سٹار ہوٹل کی لانڈری سے...... بس اتنی سی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے...... پہلے تم یہ ادرک کاٹو اور پھر دو تین پیاز چھیل دو اس کے بعد بے شک اپنے جتنے شلوار کرتے وغیرہ ہیں' وہ جمع کر کے ڈرائی کلین کروالو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں......"

کون کہتا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں پر ظلم ڈھاتی ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ صرف ادرک کاٹنے اور دو تین پیاز چھیلنے کے بعد میری بیگم نے تو کمال رحم دلی سے مجھے کپڑے ڈرائی کلین کروانے کی اجازت دے دی اور ڈوئی سے قطعی طور پر مجھے زدوکوب بھی نہیں کیا۔ البتہ جب میں اپنے کپڑوں کی گٹھڑی گھسیٹتا ہوا گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے صرف اتنا کہا "ان کی ڈرائی کلیننگ کا بل تمہیں خود ادا کرنا ہو گا...... تم مجھے جتنا ماہانہ خرچہ دیتے ہو اس میں سے تو ایک فالتو چڑیا بھی نہیں خریدی جا سکتی۔"

اب میں کشاں کشاں ایک فائیو سٹار ہوٹل کی لانڈری تک پہنچا اور اپنے کپڑے کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیئے۔ کلرک نے انگریزی بول بول کر ان کی فہرست بنائی اور رسید میرے حوالے کر دی کہ صاحب کل شام لے جائیے گا...... لیکن ایک بات پر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ لانڈری کے ایک کونے میں درجنوں سوفٹ ٹوائز یعنی نرم کھلونے پڑے

تھے۔ بڑے بڑے بھالو' بلیاں' خرگوش اور گلہریاں وغیرہ۔ "کیوں جناب! آپ یہ کھلونے بھی بیچتے ہیں؟"

"نہیں سر......" کلرک نے مؤدب ہو کر کہا۔ "انہیں ہم ڈرائی کلین کرتے ہیں۔ معزز حضرات کے بچے جب ان کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو اگر کسی ملازم کا ہاتھ لگ جائے تو یہ گندے ہو جاتے ہیں تو جراثیم کو تلف کرنے کے لیے انہیں ڈرائی کلین کیا جاتا ہے۔"

"لیکن یہ تو بالکل نئے اور صاف ستھرے ہیں۔"

"آپ کو ملازموں اور غریب لوگوں کے ہاتھوں کے جراثیم اور گندگی نظر نہیں آتی۔ معزز لوگوں کے بچوں کو نظر آ جاتی ہے...... اور خرچہ بھی زیادہ نہیں...... مثلاً یہ جو بڑا بھالو ہے یہ صرف پانچ سو روپے میں ڈرائی کلین ہو جاتا ہے...... آپ کے پاس اگر کوئی بھالو ہے تو آپ بھی لے آیئے۔"

لانڈری سے باہر آ کر میں نے رسید چیک کی تو میرے سات عدد سوتی شلوار قمیض کی ڈرائی کلیننگ کے اخراجات صرف سوا دو ہزار روپے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میرے تمام کپڑے لانڈری میں پڑے ہیں اور میں گھر میں بیٹھا رہتا ہوں کیونکہ سوا دو ہزار روپے کہاں سے لاؤں...... چنانچہ انہی پرانے کپڑوں میں گزارہ کر رہا ہوں اور معزز بھی نہیں ہو سکا۔

کاش! میں کسی امیر آدمی کے بچے کا نرم کھلونا یعنی بھالو یا بندر ہوتا تو ہر روز ڈرائی کلین ہو کر معاشرے میں بلند مقام پاتا جہاں انسان کو پرکھتے نہیں سونگھتے ہیں۔

☆☆☆

"چھیڑ اور المشہور میں فرق ہوتا ہے!"

چھیڑ اور المشہور میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ اس باریک فرق سے آگہی نہ رکھنے والے یقیناً اپنے ثقافتی ورثے سے واقف نہیں ہیں۔

چھیڑ وہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کو اوئے ٹینڈے' اوئے باندریا اوئے مچھر وغیرہ کہہ کر پکاریں تو وہ شخص تاؤ میں آ کر نزدیک ترین شے تھام کر...... عام طور پر ایک اینٹ اٹھا کر آپ کے خاندان کے بارے میں شدید نازیبا فقرے اگلتا آپ کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اسی لیے چھیڑنے سے پیشتر دفاعی حکمت عملی طے کر لی جاتی ہے بلکہ فرار کے راستوں کا تعین کر لیا جاتا ہے اور ہنڈرڈ میٹر ڈیش لگانے والے کسی کھلاڑی کی طرح بگٹٹ بھاگنے کے لیے بدن کو تیار کر لیا جاتا ہے۔

اور المشہور وہ ہوتی ہے یا ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو بھاکن ٹُٹا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بالکل مائنڈ نہیں کرتا اور آپ کو "آؤ میرے جانِ جگر" کہہ کر گلے لگا لیتا ہے' کیونکہ یہ نام اس کی کسی صفت یا خصلت کی نمائندگی کرتا ہے۔

پچھلے دنوں میں اپنے انڈے ٹوسٹ کے ناشتوں سے تنگ آیا ہوا ایک معزز اور باقاعدہ لاہوری ناشتے کے لیے رائل پارک گیا اور کار میں بیٹھنے کے بجائے دودھ دہی' حلوا پوری اور سری پائے کی دکانوں کے آگے گلی میں آراستہ کرسیوں میں سے ایک پر جا براجمان ہوا...... بڑے ریستورانوں میں اوپن ایئر ڈائننگ کو انجوائے کیا جاتا ہے جب کہ آپ کے لیے خصوصی ثقافتی موسیقی کا بندوبست یوں ہوتا ہے کہ چند تھکے ہوئے سازندے' جو بے سرے ہونے کی وجہ سے ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر کام حاصل نہیں کر سکتے وہ اپنے کمالات دکھا رہے ہوتے ہیں اور پبلک اس ثقافتی مظاہرے پر جھوم رہی ہوتی ہے اور بعد میں کسی سازندے کو

شاباش دیتے ہوئے کہتی ہے...... بیوٹی فل آپ ستار کتنی اچھی بجاتے ہیں اور سازندہ ذرا شرمندہ ہو کر کہتا ہے...... مولا خوش رکھے میں تو سارنگی بجا رہا تھا...... تو میں بھی رائل پارک کے اوپن ایئر ریستوران میں بیٹھا تھا اور آس پاس جو لاہوری ثقافت تھی، وہ مفت میں مظاہرہ کر رہی تھی۔ اتنی دیر میں ایک چھوٹا آیا، جو خاصا دراز قد تھا اور اس نے ٹین کی میز پر سلور کے بنے ہوئے ایک لسّی کی جھاگ سے لبریز گلاس کو "ٹھاہ" کر کے رکھا اور جانے لگا تو میں نے کہا یار پوچھ تو لیا کرو کہ گاہک نے کیا کھانا پینا ہے...... اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس گلاس اٹھایا اور چلا گیا...... عجیب بد تمیز چھوٹا تھا۔

میں نے کچھ دیر صبر کیا اور پھر اس چھوٹے کو آواز دی، جو لسّی کے گلاس انگلیوں میں پروئے لپکتا چلا جا رہا تھا...... "یار گاہکوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں! میں نے صرف یہی کہا تھا ناں کہ گاہک سے پوچھ لیا کرتے ہیں کہ کیا کھانا پینا ہے۔"

"کیا کھانا پینا ہے؟"

"لسّی کا ایک گلاس اور گرم قلچہ۔"

"پوچھنے کا کوئی فائدہ ہوا ہے۔" اس نے ایک گلاس پھر سے "ٹھاہ" کر کے میز پر رکھ دیا۔ "خواہ مخواہ میرا ٹائم ضائع کیا ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"طوطی۔"

"اصل نام کیا ہے؟"

"طوطی"

اب غور کرتا ہوں تو اس چھوٹے کی ناک واقعی طوطے سے مشابہت رکھتی تھی...... اب مزید غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر چھوٹوں اور دکانداروں کے نام بھی اسی قسم کے ہیں۔ سری پائے والے چھوٹے کو سب گاہک "اوئے بیاری" کہہ کر بلا رہے تھے اور وہ دبلا پتلا اور قدرے کمزور تھا۔ اگرچہ بے حد پھرتیلا تھا۔ یہاں بھی ایک "کن مُٹا" تھا، جس کا کان کسی اکھاڑے میں پہلوانی کے شوق سے ٹوٹ گرا تھا...... یہاں ایک "شہزادہ" بھی تھا، جو ذرا شان سے چلتا تھا اور ایک "باؤ" تھا، جو بار بار بال سنوارتا اور انگریزی کے لفظ یعنی تھینک یو، گڈ بائے اور بائے بائے استعمال کرتا تھا۔ ایک "ریما" بھی تھی یا تھا...... جو ذرا لچک کر اداؤں کے ساتھ چلتا تھا...... یہ سب کے سب "المشہور" تھے۔ میں نے سوچا انہوں نے زندگی کو کتنا آسان کر لیا ہے...... عام نام سے کیا پتا چلتا ہے کہ محمد شریف، شفیع محمد یا

مستنصر باللہ کیسے ہوں گے لیکن طوطی، بیاری، باؤ یا شہزادہ کہنے سے پوری شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔ بینظیر، نواز شریف، ولی خان یا عمران خان وغیرہ بھی "المشہور" ہوتے تو ووٹروں کے لیے اور عام لوگوں کے لیے کتنی آسانی ہو جاتی۔ اب ان کے اور بیشتر سیاسی لیڈروں کے "المشہور" میرے ذہن میں تو آتے ہیں لیکن فساد خلق کا خدشہ ہے، رہنے ہی دیں......

ایک بار ننکانہ صاحبہ کی جانب بائی روڈ جانے کا اتفاق ہوا تو ٹریفک سے بچنے کے لیے ایک غیر معروف راستہ اختیار کر لیا...... وہاں جابجا بورڈ آویزاں تھے، جن پر کسی بزرگ کے مزار کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی کہ حضرت فلاں فلاں کا مزار اتنے کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اُن کے نام سے درویشی اور بزرگی عیاں تھی۔ پھر ان کے عرس کے کچھ اشتہار بھی دکھائی دیئے...... آخر کار دور سے ہی ایک شاندار گنبد اور جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آئے۔ جب قریب آئے تو ایک بہت بڑے بورڈ پر لکھا تھا "مزار اقدس حضرت فلاں فلاں...... المشہور شانوں مشین گن......" میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ بھئی یہ کس قسم کے بزرگ ہیں...... انہوں نے بتایا کہ موصوف اپنے وقت کے نامی گرامی بدمعاش تھے، پھر ایک پولیس مقابلے میں مارے گئے...... برادری مضبوط اور دولت سے مالا مال تھی، انہیں شک تھا کہ ان کے ایک سیاسی مخالف نے انہیں مروا دیا ہے۔ چنانچہ یہ مزار تعمیر کروایا گیا تاکہ مخالفین پر دہشت طاری کی جا سکے...... اب وہاں عرس ہوتا ہے اور چڑھاوے چڑھتے ہیں...... اور حضرت کا المشہور بھی لکھ دیا گیا ہے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے...... بس اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سیاسی رہنماؤں کے "المشہور" بھی لکھ دیئے جائیں تو ووٹروں کو بھی کوئی غلط فہمی نہ رہے...... اگر آپ الیکشن کے دوران کسی المشہور "ماسی مصیبتے" کو ووٹ دیتے ہیں تو پہلے سے جانتے ہیں کہ ماسی اقتدار میں آئے گی تو کسی کو بولنے نہ دے گی، ہاتھ لہرا لہرا کر مخالفین کو کوسنے دے گی اور زبان اور بیان پر اتنا عبور ہو گا کہ اسے عبور کر کے کہیں کی کہیں چلی جائے گی...... اور اگر آپ اپنا ووٹ کسی "آ بیل مجھے مار" کو دے دیتے ہیں تو ظاہر ہے یہ کوئی بل فائٹر قسم کی چیز ہوں گے جو ہر کسی کو چیلنج کرنے، انہیں اپنے اکھاڑے سے نکال باہر کرنے پر کمربستہ ہوں گے...... اور بالآخر بل کو تاؤ آ جائے گا اور وہ انہیں سینگوں پر اٹھا لے گا......

ہمارے ایک سیر کے ساتھی شیخ ریاض صاحب نے ایک عجیب فلاسفی ایجاد کی ہے اور وہ ان دنوں اس کا پرچار شد و مد سے کر رہے ہیں...... ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنا ماضی اور پیشے چھپانے نہیں چاہئیں...... بلکہ انگریزوں کی طرح انہیں اپنے نام کا ایک حصہ بنا لینا چاہیے مثلاً انگریز کا نام رابرٹ شومیکر بھی ہوتا ہے...... مائیکل ٹیلر بھی ہوتا ہے...... یعنی انہیں اپنے

موچی یا درزی ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے آباواجداد میں سے کوئی ایک اس پیشے سے منسلک رہا ہو...... اسی طرح فشرمین بھی عام نام ہے یعنی مچھیرا صاحب وغیرہ...... لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تجویز کم از کم اردو میں قابل عمل نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی صاحب اے آر موچی، پی آر درزی...... یا پھر ایکس وائی نائی کہلانے کو تیار نہیں ہوں گے، کیونکہ انگریزی میں تو یہ پیشے معزز لگتے ہیں، لیکن اردو میں ذرا عجیب سے لگتے ہیں......

انہی شیخ صاحب کی تحقیق ہے کہ گوجرانوالہ اور فیصل آباد میں پورے پاکستان کی نسبت زیادہ تعداد میں حاجی صاحب پائے جاتے ہیں...... یہ نہیں کہ ان صنعتی شہروں کے مکین زیادہ تعداد میں حج کو جاتے ہیں، صرف حاجی کہلانے کی بات ہو رہی ہے۔ لاہور اور کراچی وغیرہ میں تو حج سے واپسی پر نام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن گوجرانوالہ اور فیصل آباد میں ہو جاتی ہے۔ اس کی توجیہہ وہ بڑی دلچسپ بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کی برکت سے بیشمار چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے اپنی شب و روز کی محنت سے بڑے بڑے صنعت کار بن گئے...... اب صنعت کار تو بن گئے لیکن ان کے نام وہی پرانے ہی چلتے رہے...... یعنی شیدا سوتر والا...... بٹ دریاں والا...... فاروق پیچ کس یا میاں ماڈرن بنیان...... اور انہیں ناموں میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ ان کی پہچان تھے لیکن اب بدلتی ہوئی گلوبل صورتحال میں فلاں ٹیکسٹائل ملز یا فلاں میکینکل کمپلیکس کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے لیے شیدا سوتر والا اور فاروق پیچ کس کہہ کر اپنے آپ کو متعارف کروانا ذرا عجیب سا لگتا تھا...... چنانچہ حج کی برکت سے اب وہ حاجی صاحب کہلاتے ہیں۔

میرے نہایت قریبی جاننے والوں میں سے ایک شیخ صاحب تھے، جو آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر جب گھریلو خواتین سارا دن نمک اور مرچیں کوٹتی رہتی تھیں اور ریڈی میڈ مصالحہ جات کا کہیں کوئی نام و نشان تک نہ تھا تو انہوں نے اپنے گھر میں ریڈی میڈ مصالحے پیک کرنے کا کام شروع کیا...... ہر کسی نے ان کے اس کانسپٹ کو وقت کا ضیاع قرار دیا کہ بھائی صاحب ہر گھر کی ہانڈی میں مصالحوں کا تناسب گھر والوں کے ذائقے کے مطابق جدا جدا ہوتا ہے، آپ اپنا وقت اور پیسہ ضائع نہ کریں لیکن انہوں نے کسی کی نہ سنی...... وہ دولت کمانے میں تو زیادہ کامیاب نہ ہوئے مگر آج کی ریڈی میڈ مصالحہ مارکٹ کو دیکھا جائے تو وہ اس کے پائنیر ٹھہرتے ہیں...... مجھے یاد ہے کہ ہم سب لوگ انہیں چاچا کراؤن گرم مصالحہ ہی کہتے تھے اور وہ اپنا تعارف بھی اسی نام سے کرواتے تھے...... اور بے حد فخر محسوس کرتے تھے۔

میرے بچپن کے جو گاؤں تھے ان میں بھی اس زمانے میں کئی "المشہور" خاندان ہوا کرتے تھے اور کچھ تو اب بھی انہی ناموں سے پہچانے جاتے ہیں مثلاً میرے عزیزوں میں سے کسی ایک خاندان کے بڑے کا گلا خراب تھا اور وہ ذرا گھگھیا کر بات کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں گھگھا کہا جانے لگا...... اب ان کے خاندان کے تمام افراد زمیندار اور نہایت متمول ہونے کے باوجود گھگھے کہلاتے ہیں اور جس مشترکہ رہائشی کمپلیکس میں وہ رہتے ہیں اس کے باہر بورڈ پر "گھگیا ہاؤس" لکھا ہوا ہے۔

کسی زمانے میں ہمارے علاقوں میں سوت اور کھڈیوں کا کاروبار بہت منافع بخش تھا اور ایک صاحب نے سوت کا کچھ ذخیرہ کر کے بعد میں اسے مہنگے داموں فروخت کیا جو کاروباری حوالے سے معیوب نہ تھا، لیکن اس کے باوجود مشہور ہو گیا کہ انہوں نے بلیک کی ہے۔ چنانچہ ان کے نام کے ساتھ بلیکیا کا اضافہ ہو گیا اور یہ "المشہور" آج تک چلتا آ رہا ہے۔

اسی طور ہماری اپنی برادری میں ایک "جھوٹوں کا خاندان" ہے۔ معلوم نہیں کتنی نسلیں پہلے ان کے کسی بزرگ نے ایک بار جھوٹ بولا تو "جھوٹے" مشہور ہو گئے...... آج تک ان کی آل اولاد "جھوٹے" کہلاتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی زمیندار ہیں اور کھاتے پیتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک صاحب باقاعدہ بزرگ بھی ہوئے اور کہتے ہیں کہ غیب کا حال بتاتے تھے لیکن اس کے باوجود نام کے ساتھ جھوٹے بڑے ادب سے لکھا جاتا تھا۔ میری والدہ کبھی ان کے گھر جاتیں تو کہتیں "میں ذرا بھائی جھوٹے کے گھر جا رہی ہوں۔"

وہ اچھے زمانے تھے، معصوم زمانے تھے، لوگ نسل در نسل اپنی کسی ایک غلطی کا اعتراف کرتے تھے، پردہ پوشی نہیں کرتے تھے۔ آج لاکھوں لوگ جھوٹے، بلیکیے اور رشوت خور ہیں اور مسلسل ہیں لیکن ہماری جرأت نہیں ہوتی کہ ہم انہیں اس "المشہور" نام سے پکاریں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آئندہ عدالت جہاں سزا دیتی ہے وہاں یہ بھی شرط لگائے کہ جناب آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ نادہندہ، بجلی چور، رشوت خور، کوآپریٹو خور، بے ایمان اور ننگ وطن لکھا جائے گا۔ شناختی کارڈ پر بھی اور پاسپورٹ پر بھی اور آپ کے بچوں کے نام کے ساتھ بھی یہی شناخت ہوگی ہمیشہ کے لیے...... اگر ایسا ہو جائے تو خلق خدا کو بڑی آسانی ہو جائے......

☆☆☆

''شتر مرغوں کی ریاست''

خواتین و حضرات' انسان اگر خوش قسمت ہو تو اسے دنیا میں بھی بہت کچھ مل جاتا ہے...... اسے ایک اچھی اور سگھڑ بیوی مل جاتی ہے۔ فرمانبردار اور لائق اولاد مل جاتی ہے۔ ناقابل واپسی قرضہ مل جاتا ہے۔ وزیراعظم کی ایڈوائزری مل جاتی ہے۔ موٹروے مل جاتی ہے۔ گولڈن ہینڈ شیک مل جاتی ہے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جاگیر کے ساتھ سیاست مل جاتی ہے...... اور اگر وہ بہت ہی خوش قسمت ہو تو اسے شتر مرغ کا انڈا مل جاتا ہے۔

پچھلے دنوں میں بھی بہت خوش قسمت رہا اور مجھے شتر مرغ کا ایک انڈا مل گیا......

اسے آپ ایک مزاحیہ بیان ہرگز نہ سمجھیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ شتر مرغ کا انڈا ملنا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا' مثلاً آپ میں سے کتنے ہیں جنہوں نے سچ مچ شتر مرغ کا انڈا دیکھا ہو؟ آپ کو شاید یہ بھی علم نہیں ہو گا کہ شتر مرغ انڈے دیتا ہے یا بچے...... چونکہ یہ شیر نہیں ہوتا' جنگل کا بادشاہ نہیں ہوتا کہ جی چاہے تو بچہ دے' جی چاہے تو انڈا دے...... شتر مرغ صرف انڈے دیتا ہے...... تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ چند روز بیشتر میرا بیٹا سمیر جو ایک آرٹس کالج میں زیر تعلیم ہے' میری سٹڈی میں آیا اور میری رائٹنگ ٹیبل پر ایک سفید گیند رکھ کر بولا ''ابو ذرا چیک کریں کہ یہ کیا ہے؟''

''گیند ہے اور کیا ہے؟''

''نہیں ابو چیک کر کے بتائیں کہ کیا ہے؟''

میں نے چیک کیا...... یہ چھوٹے تربوز سے چھوٹا تھا اور سبز نہ تھا' مالٹے سے بڑا تھا اور زرد نہ تھا۔ سفید رنگ کا کوئی پھل میں نے آج تک دیکھا نہ تھا تو پھر یہ کیا تھا......

''یہ شتر مرغ کا انڈا ہے ابو......'' سمیر نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔

''سچ مچ کے شتر مرغ کا؟''

''ابو کبھی جھوٹ موٹ کے شتر مرغ کا بھی انڈا ہوتا ہے...... آپ بھی مالیاتی مشیروں جیسی باتیں کرتے ہیں۔''

''بیٹے انڈے چرانا اور خاص طور پر شتر مرغ کے نہایت معیوب حرکت ہے......''

''حد کرتے ہیں آپ بھی...... بھلا پاکستان میں شتر مرغ کہاں پائے جاتے ہیں......''

''سوری...... میرا خیال تھا کہ تم کسی اعلیٰ سرکاری ادارے کے گرد گھومتے رہتے ہو تو یہ انڈا کہاں سے آیا؟''

''آسٹریا کے ایک آرٹ انسٹیٹیوٹ نے ایک بین الاقوامی مقابلہ منعقد کیا ہے۔ مختلف ملکوں کو شتر مرغ کے انڈے روانہ کیے ہیں کہ ان پر جو جی چاہے نقش و نگار بنائیں۔ پینٹ کریں تو ہمارے کالج کو بھی پندرہ انڈے بھیجے گئے ہیں۔ چونکہ میری ڈرائنگ بہت اچھی ہے' اس لیے پرنسپل صاحب نے انڈہ دے دیا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اس پر کیا بناؤں......''

''میری مانو تو اس کا آملیٹ بنالو۔ سارا خاندان سیر ہو کر کھائے گا اور پھر بھی بچ رہے گا۔''

''ابو آپ اسے اٹھا کر دیکھیں' اندر سے خالی ہے۔ آملیٹ نہیں بن سکتا......''

میرا بیٹا اپنے امتحانوں میں مصروف ہو گیا اور یہ انڈا میری سٹڈی ٹیبل پر پڑا رہ گیا۔ اس کی موجودگی کا رعب اتنا تھا کہ نہ تو میں کالم لکھ سکا اور نہ کوئی سفرنامہ یا ناول...... لکھنے بیٹھتا تو یہ انڈا میرے حواس پر سوار ہو جاتا۔ کئی بار رات مجھے شک ہوتا کہ ابھی اس میں دراڑیں نمودار ہوں گی اور ایک چھوٹا سا شتر مرغ باہر آ کر اذان دینے لگے گا۔ ایک بار اسے الماری میں رکھا تو بھی یوں محسوس ہوتا کہ وہ احتجاج کر رہا ہے یا ایک شتر مرغ بچہ دستک دے رہا ہے۔ چنانچہ انڈا پھر سے میری سٹڈی ٹیبل پر آ گیا۔

اسے دیکھ دیکھ کر میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آنے لگے...... میں نے سوچا' ان زمانوں میں دنیا بھر میں ایتھنک تحریکیں جاری ہیں۔ ہر شخص اپنی زبان اور کلچر کے حوالے سے دوسروں سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ سوویت یونین میں صرف کمیونزم ناکام نہیں ہوا کہ یہی کمیونزم چین میں اتنا کامیاب ہے کہ امریکہ صاحب بہادر کی گھگھی بندھی ہوئی ہے بلکہ مختلف نسلوں کے لوگ اپنے رواج اور زبان کی شناخت کی چاہت میں اپنی الگ ریاستوں کے خواب دیکھنے لگے ہیں...... اور ان میں سے بہت سوں نے کامیابی بھی حاصل کر

لی...... تو اس ایتھنک دور میں یہ بھی عین ممکن ہے کہ کل کلاں دنیا بھر کے شتر مرغ بھی ایک ریاست کا مطالبہ کر دیں۔ اگر امریکہ اور یورپی طاقتیں ان کا ساتھ دیں تو یہ ریاست اسرائیل کی طرح دنیا کے کسی بھی خطے میں قائم ہو سکتی ہے۔ مقامی آبادی کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ ان کے گھر مسمار کر کے انہیں دہشت پسند کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہیومن رائٹس کی ڈفلی بھی لگاتار بجائی جائے...... اگر ایک شتر مرغ ریاست قائم ہو جائے تو وہ کیسی ہو گی؟ ظاہر ہے اس میں شتر مرغ سیاستدان ہوں گے۔ بیورو کریٹ، سرمایہ دار اور ادیب بھی شتر مرغ ہوں گے...... اس ریاست کی نگہبانی کرنے والے بھی شتر مرغ ہوں گے...... چونکہ ان دنوں میڈیا ایک ریاست کے اغراض و مقاصد کی تشہیر کرنے کے لیے بے حد طاقتور ذریعہ اظہار ہے، اس لیے یقیناً ایک شتر مرغ ٹیلی ویژن بھی ہو گا۔ اس کے متوقع پروگرام کچھ یوں ہوں گے۔

صبح سویرے نشریات کا آغاز ایک مشترکہ دعا سے ہو گا جس میں بچہ شتر مرغ ہاتھ باندھے مؤدب کھڑے ہوں گے۔ وہ بے شک ٹوپیوں کے بغیر ہوں گے لیکن شتر مرغیاں دوپٹے اوڑھے ہوئے ہوں گی کیونکہ تازہ ترین پالیسی اناؤنس ہو چکی ہو گی...... دعا کچھ یوں ہو گی کہ یا اللہ تیرا شکر کہ تو نے ہمیں شتر مرغ بنایا۔ اگر لُومڑ بنا دیتا تو ہم کیا کر لیتے۔ تیرا شکر کہ تو نے ہمیں تحریک شتر مرغ ریاست کی جدوجہد میں کامیاب فرمایا...... ہم پر آئی ایم ایف کی رحمتیں قرضوں کی صورت میں نازل کیں جو ہم کبھی بھی اتار نہ پائیں گے۔ چاہے قرض اتارو شتر مرغ سنوارو کی مہم بھی شروع کر لیں...... دعا کے بعد نشریات کی شتر مرغی میزبان آئے گی اور شتر غمزے دکھائے گی...... شام کے پروگراموں کی تفصیل کچھ یوں ہو گی۔ شتر مرغوں میں بے راہ روی کے اسباب اور ان کا سدباب...... ایک روح پرور لیکچر جو بزرگ شتر بے مہار دیں گے۔ موسیقی کا پروگرام شتر رنگ...... جس میں پاپ کے دلدادہ نوجوان شتر مرغوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ شتر مرغیاں بھی دل آزار ملبوس میں نہیں گا سکیں گی۔ بھائی چارے اور اخوت پر مبنی پروگرام "شتر کینہ" اس کے بعد پیش کیا جائے گا۔ "شتر شو" میں ایک تھکے ہوئے اور ہانپتے ہوئے میزبان آپ کو شعر سنائیں گے...... کوئی امید بر نہیں آتی۔ کوئی مرغی نظر نہیں آتی...... نو بجے حسب معمول "شتر نامہ" ہو گا جس میں حسب سابق پہلے وزیراعظم پھر صدر کا۔ پھر مختلف صوبوں کے چیف منسٹر، پھر گورنر، پھر چیف جسٹس، پھر وزراء، پھر ممبر نیشنل اسمبلی، ممبر سینٹ دکھائے جائیں گے اور سب اپنی اپنی بولیاں بولیں گے اور اڑ جائیں گے...... چونکہ شتر نامے کے دوران آپ پر نیند غلبہ حاصل کر لے گی، اس

لیے نشریات کا اختتام کر دیا جائے گا...... نصف شب کے قریب جب سب شتر مرغ سو چکے ہوں گے تو نشریات پھر شروع ہوں گی اور حالات حاضرہ کا پروگرام "شتر بین" پیش کیا جائے گا۔ اس میں صحافی، ادیب، بیورو کریٹ اور عوامی نمائندے بین بجائیں گے جس کی دھن حاکم وقت نے تیار کی ہو گی اور پھر یہ سب خود ہی جھومیں گے اور حکومت کی معاشی پالیسیوں اور امن عامہ کی صورتحال پر اطمینان کا اظہار کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک اگلے روز مشیر یا سفیر ہو جائے گا۔ نشریات کے آخر میں پروگرام "شتر فورم" پیش کیا جائے گا جو براہ راست ٹیلی کاسٹ ہو گا یعنی لائیو ہو گا......

لائیو "شتر فورم" میں ایک شتر مرغ سیاستدان تشریف رکھتے ہیں اور ایک میزبان ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس پر سیاستدان انہیں کہتے ہیں "بھئی پروگرام شروع ہونے کو ہے، اب تو بیٹھ جاؤ۔ پروگرام کے اختتام پر بے شک پھر کھڑے ہو جانا......"

میزبان بیٹھ جاتا ہے اور سوالوں کی اس فہرست پر ایک نظر ڈالتا ہے جو سیاستدان اسے لکھ کر دے چکے ہیں کہ بعد میں یہی سوال پوچھنے ہیں...... وہ ٹیپ بھی تیار ہے جس میں مختلف آوازوں میں سوال ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ یہ سوال مبینہ طور پر ناظرین پوچھیں گے اور کہا یہ جائے گا کہ ابھی ابھی ٹیلی ویژن کے ایک ناظرین نے براہ راست یہ سوال پوچھا ہے......

میزبان ایک نہایت چاپلوس شتر مرغ ہے۔ وہ سوالات کا آغاز کرتا ہے۔ "جناب آپ یہ بتائیں کہ آپ شتر مرغ ریاست کے لیے کیا کریں گے؟"

"میں وہی کروں گا جو میرا جی چاہتا ہے کیونکہ میرے پاس مینڈیٹ ہے۔"

"آپ کے پاس مینڈک ہے؟ یہ کیا فرما رہے ہیں؟"

"مینڈک نہیں، مینڈیٹ بے وقوف...... مجھے ریاست بھر کے شتر مرغوں نے ووٹ دیئے ہیں۔"

"ماشاءاللہ تو آپ اس ریاست کو کیا بنائیں گے؟"

"میں اسے ایشین ٹائیگر بنا کر چھوڑوں گا......"

"خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے گا جناب......"

"نہیں میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ میں اس ریاست کو ضرور بہ ضرور ایشین ٹائیگر بناؤں گا۔"

"جناب عالی یہ تو بہت ظلم ہو گا اگر آپ اسے ٹائیگر بنا دیں گے تو وہ ہم سب شتر مرغوں کو کھا جائے گا......"

”کتنے کھا جائے گا؟ بالآخر شتر مرغ کھا کھا کر اُس کا دل بھر جائے گا...... ویسے ابھی تو اس کی دم بھی دکھائی نہیں دیتی‘ اس لیے کچھ وقت لگے گا......“

”ویسے ہماری ریاست کے اور بہت سارے مسائل ہیں جن میں ایک مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی کا بھی ہے۔ اگرچہ ہم نے ”شتر مرغ دو ہی اچھے“ مہم چلا رکھی ہے لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا...... بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے آپ کیا کریں گے؟“

”بے وقوف اگر میں اس ریاست کو ایشین ٹائیگر بنا دوں گا تو اسی لیے بنا دوں گا کہ وہ ٹائیگر آدھے شتر مرغ نوش کر لے۔ یوں آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا......“

”اور یہ جو مسئلہ ہے عدلیہ اور پارلیمنٹ کے اختیارات کا؟...... اس کے بارے میں“

اس مرحلے پر اسکرین پر ”انتظار فرمائیے“ کی سٹل آ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی جگہ ایک اور سٹل سکرین پر آتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے ”خواتین و حضرات ہم شتر مرغوں کے تمام مسائل کا حل اس میں ہے کہ ہم سب اپنے سَر ریت میں چھپا لیں...... تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور شتر مرغ ریاست ترقی کی منازل طے کرتی کرتی وہاں پہنچ جائے گی جہاں اس کے سیاستدان اسے پہنچانا چاہتے ہیں۔“

